معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۵ ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی مجلس عاملہ کے موقر صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے ایما سے مارچ کے اوائل ہی میں مجلس انتظامیہ کا جلسہ ۲ مئی کو ہونا طے پاگیا تھا۔ جس کا ہونا بعض اہم امور و مسائل کو طے کرنے اور بجٹ کو منظور کرانے کے لیے نہایت ضروری تھا، اس وقت خیال نہیں تھا کہ موسم اتنا سخت ہوجائے گا اس لیے تمام ارکان کو دعوت نامے بھیج دیے گئے اور جلسے میں بعض حضرات کی شرکت کی اطلاع بھی آگئی تھی، ریلوے سروس نہ ہونے کی وجہ سے اعظم گڈھ کا سفر بہت دشوار رہے، ان تمام موانع اور گوناگوں اعذار کے باوجود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اپنے رفیقوں اور عزیزوں مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اور بھائی عبدالرزاق صاحب کے ہمراہ جب اعظم گڈھ تشریف لائے تو دارالمصنفین کے کارکنوں نے فخر و مسرت کے ساتھ کہا ع اے آمدنت باعث آبادی ما۔ جناب عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری کی درخواست پر ایک روز قبل دہلی سے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے تشریف لاکر ممنون کیا۔ مقامی ارکان مرزا امتیاز بیگ اور ڈاکٹر سلمان سلطان اپنے کاموں کو چھوڑ کر جلسے میں شریک ہوئے، جو حضرت مولانا علی میاں کی صدارت میں ہوا۔

دارالمصنفین کی اصل شہرت و عظمت اس کے علمی شعبہ کی وجہ سے ہے لیکن مادیت کی جانب عام رجحان اور شدید مالی حرص و طمع کی وجہ سے اب خالص علمی و تحقیقی ذوق اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ مفقود ہوتا جارہا ہے، موجودہ ہوش ربا گرانی اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات بھی علم و تحقیق کی جانب راغب ہونے میں مانع ہو رہی ہیں، دارالمصنفین کا سارا دار و مدار اس کی کتابوں کی تجارت پر ہے اور یہ بار بار لکھا جاچکا ہے کہ بعض خود غرض

ناشرین کتابوں کو غیر قانونی و غیر اخلاقی طور پر شایع کرکے دارالمصنفین کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں، اس پرآشوب دور میں ایسے محدود وسائل و ذرائع رکھنے والے ادارے کو مناسب، موزوں اور ایثار پسند رفقا اور کارکن ملنا بہت دشوار ہوگیا ہے، اس کے لیے زبانی اور تحریری اپیل بار بار کی گئی مگر ہم کو اعتراف ہے کہ ہماری آواز صدا بصحرا ہوگئی۔ اس کے تدارک کے لیے معزز ارکان نے چند اہم فیصلے کیے جنھیں اعلان کے طور پر ان صفحات میں شایع کیا جارہا ہے۔

طے کیا گیا کہ ایک ایک یا دو دو سال کے لیے عارضی اسکالر منتخب کیے جائیں جو اس مدت میں دارالمصنفین میں رہ کر کوئی مجوزہ علمی تحقیقی کام کریں جس کی نگرانی کسی بڑی علمی شخصیت کو سپرد ہو، اگر ان کا کام مدت کے اندر انجام پاگیا اور اطمینان بخش ہوا، اور وہ راضی ہوئے تو ان کو دارالمصنفین کا رفیق مقرر کیا جاسکتا ہے، اس مدت میں دارالمصنفین انھیں ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ دے گا، سردست کم از کم دو اسکالر منتخب کیے جائیں، ان کی درخواستوں پر غور کرنے اور ان کا انتخاب کرنے کے لیے مجلس انتظامیہ نے اپنے اندر سے ایک کمیٹی کی تشکیل کی ہے جو کام کا تعین اور موضوع کا انتخاب کرے گی۔ دوسری تجویز یہ منظور کی گئی کہ یونیورسٹیوں یا جامعات عربیہ کے مشہور اساتذہ میں سے ہر سال دو استادوں کو وزیٹنگ اسکالر کی حیثیت سے مدعو کیا جائے جو کم از کم دو ماہ دارالمصنفین میں قیام کرکے رفقا کو مشورے دیں، ان کے کاموں کو دیکھیں اور خود بھی کوئی تحقیقی مقالہ تیار کرکے دارالمصنفین کو دیں، انھیں قیام و طعام کی سہولت کے علاوہ دارالمصنفین کی طرف سے مبلغ دو ہزار روپیہ اکرامیہ بھی پیش کیا جائے گا، مذکورہ بالا کمیٹی ہی اسکالروں کی ایک فہرست تیار کرکے اور ان کا انتخاب کرکے انھیں باری باری مدعو کرے گی۔

دار المصنفین کے علمی کاموں کو مزید وسعت دینے کی غرض سے جلسہ کے خصوصی مدعو مولانا ڈاکٹر سید عبداللہ عباس ندوی کی یہ تجویز منظور کی گئی کہ بین الاقوامی سطح پر معروف اصحاب علم و تحقیق کو دار المصنفین، شبلی اکیڈمی کا اعزازی مراسلاتی ممبر بنایا جائے جس کی کوئی فیس نہیں ہوگی اور وہ تحقیقی مقالہ جو خاص طور پر اس اکیڈمی کے لیے عربی یا انگریزی میں وہ لکھیں، اسے یا اس کا اردو ترجمہ دار المصنفین شایع کرے۔ اس کے ۲۵ پچیس نسخے ان کو دیے جائیں، جنھیں ممبر بنایا جائے، اگر وہ اپنی منظوری کی اطلاع تین مہینے کے اندر دے دیں تو ان کے نام معارف میں شایع کر دیے جائیں، اسی ضمن میں ڈاکٹر سلمان سلطان نے شبلی اکیڈمی کے علمی و تحقیقی کام کے فروغ کے لیے ایک ایسا منصوبہ تیار کرنے کی تجویز پیش کی جس کے مطابق ریسرچ اسکالرز کو کوئی صاحب خیر وظیفہ کی رقم کے ساتھ اسپانسر کر سکیں اور یو۔ پی گورنمنٹ کے تعاون سے کچھ ریسرچ اسکالرز مقرر کیے جائیں، مجلس نے تجویز پسند کرنے کے ساتھ ان سے ایسا منصوبہ جو اکیڈمی کے تحقیقی مزاج اور علمی معیار کے مطابق ہو پوری تفصیلات کے ساتھ مرتب کرنے کی درخواست کی۔

دار المصنفین شبلی اکیڈمی میں رابطہ ادب اسلامی کے سمینار کے انعقاد پر غور کرنے کے بعد طے پایا کہ سکریٹری رابطہ ادب اسلامی سے مشورہ کے بعد اکتوبر ۱۹۹۵ء کے اواخر میں یہ سمینار منعقد ہو اور اس سلسلے میں مندوبین اور شرکاء کے قیام و ضیافت کے متعلق انتظامیہ مقامی ارکان مرزا امتیاز بیگ صاحب اور ڈاکٹر سلمان سلطان کی مدد سے ضروری اقدامات کا آغاز کرے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جنوری ۱۹۵۰ء میں عربی مجلہ ثقافۃ الہند جاری کرایا تھا جو ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے عرب علماء میں بہت مقبول تھا مگر جنوری ۹۴ء سے اس کا کوئی شمارہ نہیں چھپا، مرکزی حکومت کی متعلقہ وزارت کو اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مقالات

ملک احمد بن پیر محمد الفاروقی الاحمد آبادی

از ڈاکٹر زبیر قریشی۔ احمد آباد

احمد آباد سلاطین گجرات کا پایۂ تخت تھا، اس لیے یہاں بکثرت علماء و مصنفین گزرے، اکبر نے جب گجرات فتح کیا اور اس کی ساری توجہ آگرہ کی جانب مرکوز ہوگئی تو احمد آباد ماند پڑ گیا اور یہاں کے علماء کو وہ شہرت نہ ملی جس کے وہ مستحق تھے بلکہ بعض بزرگوں کا ذکر تک تذکرہ نویسوں نے نہیں کیا۔ ایسے لوگوں میں ملک احمد بن پیر محمد الفاروقی الاحمد آبادی بھی ہیں۔

ملک احمد کی مصنفات ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں منتشر ہیں مگر چونکہ یہ اپنے نام کے ساتھ احمد آبادی یا گجراتی نہیں لکھتے اس لیے فہرست نگار ان کے بارے میں خاموش ہیں۔ عام طور پر لوگ جانتے نہیں کہ ملک احمد کون اور کہاں کے تھے؟ اور عام لوگ بھی ان سے اور ان کے وطن سے ناواقف ہیں۔ ان کی تصنیفات پیر محمد شاہ احمد آباد، کنز المرغوب نہروالہ پٹن (شمالی گجرات) خدا بخش لائبریری پٹنہ اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بکھری پڑی ہیں۔ جن سے ان کے متعلق کسی قدر معلومات فراہم ہوتی ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں کا سن اختتام حتماً درج کیا ہے۔ لہٰذا ترتیب زمانہ کے اعتبار سے ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ شہاب بن شمس الدین دولت آبادی نے ارشاد تصنیف کی تھی (حاشیہ ص ۳۲۶ پر)

حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ نے الرشاد کے نام سے اس کی شرح لکھی تھی، جس پر ملک احمد نے حاشیہ[1] لکھا جس کا ایک نسخہ خود محشی کے خط میں کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں ہے۔ کل ۱۸۹ فولیو پر مشتمل اس مخطوطہ کے صفحات ۱۷۷ سے ۱۸۹ کرم خوردہ یا پھٹ گئے ہیں غالباً ملک احمد کے پاس الرشاد کا نسخہ تھا جو خود حضرت علوی کے خط میں تھا جس پر شارح نظر ثانی نہ کر سکے تھے۔ یہ حاشیہ ملک احمد نے شارح کی وفات کے ۶۱ سال کے بعد بروز جمعہ ۱۰ شعبان ۱۰۵۹ھ میں مکمل کیا۔ جس کی تصریح اس کے آخر میں اس طرح موجود ہے۔

قد فرغ من تحریر هذه الحواشی
علی شرح الارشاد الموسوم
بالرشاد الفقیر الغریق فی
بحار المعاصی الخائف من یوم
یوخذ فیه بالنواصی الراجی بلطف
الرؤف الصمد ملک احمد بن
بیر محمد اقاذهما الله الی
رضائه وحشرهما فی خدمة
احباءه بحق اولیاءه وانبیاءه

شرح ارشاد کے اس حاشیہ رشاد کی
تحریر سے یہ فقیر وگنہگار ملک احمد بن
پیر محمد بروز جمعہ عصر کے وقت ۱۰ شعبان
۱۰۵۹ھ فارغ ہوا، اس کی عمر اس وقت
۶۱ برس کی ہے۔

(حاشیہ ص ۳۲۵) [1] یہ کتاب اس زمانے میں کافی مقبول تھی۔ چنانچہ ابوالفضل خطیب گازرونی نے بھی اسکی ایک شرح لکھی۔ دیکھئے نمبر ۱۵۵۲ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔ یہ وہی گازرونی ہیں جو جلال الدین دوانی کے شاگرد تھے اور احمد آباد آ گئے تھے حاشیہ ص ہذا لہ نمبر ۳۲۲۔

وقت العصر فی العاشر شهر
شعبان ختم الله بالرحمة
والغفران من یوم الجمعة
سنة تسع وخمسین والف و
قد مضت علی الشارح
رحمه الله احد وستون سنة

۲۔ ملک احمد نے عضدی شرح مختصر اصول پر بھی حاشیہ[1] لکھا جو کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں محفوظ ہے۔ وہ اس کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

قد فرغ من هذا التالیف
بعون الملک اللطیف اعنی کتاب
الموسوم بالعضدی شرح مختصر
اصول العبد الغریق فی بحار
المعاصی الخائف من یوم یوخذ
فیه بالنواصی الراجی بلطف
الملک الغفور التقی ملک احمد
بن پیر محمد الفاروقی امنه الله
بما یخاف وتغمده الله فی
الکنان الاصنان ضحی یوم الخمیس

اس کتاب یعنی عضدی شرح مختصر
اصول سے اس گنہگار بندے احمد بن
پیر محمد فاروقی کو پنجشنبہ ۱۰ شعبان ۱۰۶۰ھ
کو حضرت شیخ وجیہ الدین علوی کے روضہ
مبارکہ میں فراغت ہوئی۔ اس کی ابتدا
جمعہ ۱۶ ربیع الاول ۱۰۶۰ھ کو احمد آباد
میں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس شہر کو
قحط وآفات سے قیامت تک محفوظ
رکھے۔

[1] ۱۸۵/۲ ۔

من عاشر شهر الله المبارک
شعبان سنة سبع وستين
على الالف الهجرة فی روضة
مبارکة شیخ المحققین امام السالکین
...... وجیه الملک والدین
العلوی قدس سرہ واوصل
الینا برہ بفضلہ۔
وکان ابتدائہ بعد الجمعة
الواقعة فی السادس عشر
من شهر ربیع الاول سنة
ستة وستین علی الالف
فی اللیلة المبارکة الطیبة احمدآباد
صانہ اللہ عن القحط والآفات
الی یوم التناد۔

۳۔ **ایضاح المطالب شرح تذکرة المذاهب:** اس کا ایک نسخہ شمالی گجرات کے شہر پٹن کے مدرسہ کنز المرغوب میں محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے یہ مدرسہ بعہد اورنگزیب قائم ہوا تھا۔ تذکرۃ المذاہب کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا لیکن سالارجنگ حیدرآباد[1] میں یہ کتاب ہے اور اس کے مصنف کا نام ابن الصلاح بتایا گیا ہے۔ ملک احمد نے اس کو پتلاد میں سنہ ۱۰۶۱ھ میں مکمل کیا۔ پتلاد (ضلع کھیڑا)

[1] عربی فہرست جلد اول ۱۴۲

ضلع احمد آباد سے متصل ہے جو کھنبائت کے قریب ایک قصبہ ہے۔ حاجی بہرام خاں نے اس کو ۱۲۴۵ھ میں نقل کیا ہے۔ اس میں اسلام کے ۷۲ فرقوں اور ان کے عقائد کا بیان ہے۔ ان میں سے صرف ایک ہی ناجی ہے۔ شارح لکھتے ہیں:

ان اصل العلوم الدینیة	علوم دینیہ اور مسائل یقینیہ کی
والمسائل الیقینیة علم یعرف	اصل وہ علم ہے جس کے ذریعہ
بہ ذات اللہ الملک العلام	ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت
وھو علم التوحید والصفات	حاصل ہو۔ وہ توحید اور اس کی صفات
الموسوم عندھم بالکلام	کا علم ہے جسے علم کلام کہا جاتا ہے،
الذی غاص فیہ کثیر من	جس میں کئی لوگوں نے غور وخوض
الغواص فضلوا... علی	کیا اور گمراہ ہوئے... انہوں نے
طبق مدعاھم بالتفسیر	تفسیر وتاویل میں وہ مسلک اختیار
والتاویل فضلوا واضلوا	کیا جو ان کے لیے مفید مطلب تھا
کثیرا عن سواء السبیل وقد	پس خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں
صنف جماعة من العلماء و	کو بھی گمراہ کیا۔ کئی فضلاء اور علماء
فرق من الفضلاء فی بیانھم	نے ان عقائد کے بیان میں کتابیں اور
الکتب والرسائل و بینوا	رسائل تالیف کیے جس میں اختلافات
فیھا الاختلاف والدلائل	ودلائل کی وضاحت کی۔ اسی قسم کی
وقد کان بمختصر المسمی	ایک مختصر کتاب تذکرۃ المذاہب ہے
بتذکرة المذاھب مضبوطا	جس میں فوائد کی تبیین تو ہے لیکن۔

فی تبیین الفوائد ومستوفیا
لاکثر الفرائد لکن لم یخرج
عبارته عن الاجمال الی تفصیل
فکتبت فی بعض الحال عن
سواء السبیل فاردت ان
اشرح له شرحا یصلح عبارته
ویوضح ما وقع بینهم من الاختلاف
ویبین ما اخذوا به من
طرق الاعتساف وسمیته
بایضاح المطالب فی شرح
تذکرة المذاهب۔

تفصیل کے بجائے اجمال سے کام لیا
گیا ہے، بعض جگہ اس میں صحیح راستہ
سے تھوڑا انحراف بھی ہے۔ بس میں نے
سوچا کہ میں اس کی شرح لکھوں جس میں
اس کی عبارت کی اصلاح اور اختلافات
کی صراحت کرکے اور اس کے انحراف کو
انصاف سے بدل دوں۔ میں نے اسکا
نام ایضاح المطالب فی شرح تذکرۃ
المذاہب رکھا۔

ترقیمہ اس طرح ہے:

قد فرغ من هذا التالیف
بعون الملک اللطیف العبد
الغریق فی بحار المعاصی،
الخائف من یوم یوخذ فیه
بالنواصی الراجی للطف الرحیم
التقی ملک احمد بن پیر محمد
الفاروقی جعل الله قبره

اللہ کی مدد و عنایت سے بندہ گنہگار
ملک احمد بن پیر محمد فاروقی قصبہ پتلاد
میں اس کتاب کی تالیف سے منگل ۲۱ ربیع الاول
سنہ ۱۰۶۱ھ کو فارغ ہوا۔

روضة من ریاض الجنة وانه
مرجو بالرحمة والغفران فی
قصبة پتلاد صانه الله تعالی
عن آفات الی یوم التناد وقت
الضحی یوم الثلثاء من الحادی
والعشرین من شهر ربیع الاول
المسلوک فی سلک المشهور
بالمصطفویة فی سنة احدی
وستین علی الالف الهجریة

۴۔ **شرح مقاصد**: کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں شرح مقاصد کا ایک نسخہ ہے۔ جس کے حاشیہ میں ملک احمد سے منسوب کئی اقتباسات بکثرت پائے جاتے ہیں۔

۵۔ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں ایک مخطوطہ حاشیہ علی حاشیہ خیالی ہے۔ یہ بھی ملک احمد بن پیر محمد کی تصنیف ہے مگر ناقص الطرفین ہے۔ ابتدا یوں ہے .... موجب للعلم ضروری فتأمل۔ آخری عبارت یوں ہے
"ما تقرر عند هم ان نعیم الجنة دائمة خالدة ابدیة لا فناء لها......"

۶۔ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں ایک اور مخطوطہ ہے مسمی بہ فرائض شرفی۔ اس میں ملک احمد کے اپنے خط میں تعلیقات پائے جاتے ہیں اور وہ بھی بکثرت۔

۷۔ **شرح مطول**: کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں یہ مخطوطہ محفوظ ہے۔

ملک احمد کا بیان ہے کہ:

فیقول الفقیر المعترف بالعجز	فقیر، عاجز اور پر تقصیر بندہ احمد
والتقصیر الغریق فی بحار المعاصی	بن پیر محمد فاروقی عرض پرداز ہے
الخائف من یوم یوخذ فیہ	کہ یہ حاشیے میں نے مطول پر بطور
بالاقدام والنواصی الراجی	تعلیق لکھے ہیں جو علامہ تفتازانی
للطف الملک الغفور التقی	کی تلخیص المفتاح کی شرح ہے اور
ملک احمد بن پیر محمد الفاروقی	مولانا کمال الدین کا حاشیہ ہے۔
اغناہ الیہ عما سواہ واوصلہ	
الی ما یرضاہ واعطاہ ما یرجاہ	
ووفقہ بشکر ما اعطاہ ان	
ہذہ الحواشی علقتہا علی المطول	
شرح تلخیص المفتاح لعون	
الملک الفتاح للمحقق العلامۃ	
المدقق الفہامۃ العالم	
الربانی مولانا سعد الملۃ	
والدین التفتازانی وعلی	
حاشیۃ من ہو مستغنی عن المدح	
والتوصیف اعنی مولانا کمال الدین	
الشہیر بالسید السند الشریف	

قدس اللہ سرہما

واوصل الینا برہما۔

اس حاشیہ کے لکھنے کے کچھ دن بعد ایک واقعہ پیش آیا اور انہوں نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ آگے چل کر وہ رقم طراز ہیں:

ثم لما مضی علی ذالک مدۃ	اس حاشیہ کی تکمیل کے کچھ عرصہ بعد
مدیدۃ من الزمان وقرأ	بعض حضرات مجھ سے اس کا درس
علی بعض الاخوان من الاول	لے رہے تھے کہ دفعتاً مجھے خزانے
اطلعت علی کنوز۔ فلم اتفق	مل گئے، یعنی میرے ذہن میں بعض ایسے
منہا ایدی الاعیان ووجدت	نکات آئے جن پر پہلے کسی کی نظر نہیں
فرائد لم یستخرجہا احد	پڑی تھی۔ لہذا اول کتاب کی تلفیف
الی الآن فشرعت تلفیفہا	کی اور پہلے جو لکھا اس کے ساتھ اس کی
علی ما بقی من اول الکتاب	تضمیم کی۔
وضممتہا الی ما حررتہ	
سابقا علی ابواب راجیا	
من اللہ الکریم ان یجعلہا	
ذخیر المعاد فانہ المعطی	
بفضلہ ما یراد۔	

ان کے بیان کے مطابق مذکورہ حاشیہ میں انہوں نے ایک اور اہم کام انجام دیا۔

وادرجت فیہا اکثر الحواشی	میں نے اپنے استاذ الاستاذ اور اپنی

لاستاذ استاذی وخال امی المحقق الشیخ عبد العزیز بن ولی تغمده الله برحمته وحشر فی زمرته فان اکثرها کانت علی هامش الکتاب وبعضها متفرقا فی الاوراق وبعضها ضاعت ..... وبعضها فقدت بطول الزمان فخفت ان یضیع منها فجمعت ههنا ما انتشر فانها وان کانت عدیدة لکنها مفیدة۔ والامران اللازمان علی المقابلة الثانیة ذکرهما الاستاذ عبد العزیز فی حاشیته لکن لما ضاعت النسخة التی بخطه الاجل بحیث لم یحصل منها شیئ ترکته فمن وجد ذالک فعلیه ان یلحقه۔

ماں کے ماموں شیخ عبد العزیز بن ولی کے ان حواشی کو بھی درج کیا جو جگہ جگہ حاشیوں اور متفرق اوراق میں منتشر تھے اور بعض ضایع اور امتداد وقت سے ناپید ہو گئے تھے۔ اس لیے مجھے ان کے مزید ضایع ہو جانے کا خدشہ تھا چنانچہ ان کو اس حاشیہ میں شامل کیا کیونکہ یہ حواشی اگرچہ تھوڑے مگر مفید تھے۔ شیخ عبد العزیز بن ولی کے خط میں جو نسخہ تھا وہ مجھے دستیاب نہ ہوا اس لیے اگر کسی صاحب کو یہ ملے تو وہ اس کو بھی اس میں شامل کر دیں۔

* عبد العزیز بن ولی خالدی قریشی، شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے اجل تلامذہ

میں سے تھے۔ ان کا رسالہ الحقیقۃ المحمدیہ مشہور ہے۔ اس کا ایک نسخہ خدا بخش پٹنہ میں اور ایک نسخہ کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں ہے۔ راقم الحروف نے اسکا اردو ترجمہ بھی شایع کیا ہے۔ افسوس کہ ان کی وفات کے تیس چالیس سال بعد ہی انکے رسائل ناپید اور ضایع ہونے لگے تھے۔

"خال امی" کا ترجمہ عمداً ماموں کیا گیا ہے حالانکہ خال کے معنی پھوپھا اور خالو بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ شیخ عبد العزیز بن ولی کی شرح فتوح الغیب ہے جسکا ایک نسخہ کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف ۲۷ شعبان ۱۰۱۶ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کم از کم ۱۰۱۶ھ تک شیخ عبد العزیز بن ولی بقید حیات تھے۔ اس پر سید جعفر عرف بدر عالم کی مہر ثبت ہے جو حضرت شاہ عالم کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۸۴ھ میں ہوا ہے، انہوں نے شرح فتوح الغیب ملک احمد بن پیر محمد کو تحفتاً پیش کی تھی۔ اس پر انہوں نے اپنے خط میں یوں لکھا ہے:

"بعده صارت النوبة الی العبد الفقیر ملک احمد فاروقی ابن بنت اخت الشارح وهبه سید السادات ملجأ اهل السعادات سید جعفر الشاهی الرضوی قدس الله تعالی سره واوصل الینا برّه"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شارح عبد العزیز کی بہن کی بیٹی کے بیٹے تھے۔ اس لیے حاشیہ مطول کے سلسلہ میں انہوں نے شیخ عبد العزیز کو جو خال امی کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ان کی ماں کے ماموں تھے۔

حاشیہ مطول سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ملک احمد کا شغلہ درس و تدریس رہا ہوگا۔ دوران تدریس جو نئے نکات ان کے ذہن میں آتے تھے وہی ان کے قلم سے مترشح ہو کر

تصنیف کی شکل اختیار کرتے تھے۔

کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں شیخ عبدالعزیز بن ولی کی شرح فتوح الغیب کا ایک اختصار بھی موجود ہے[1]۔ جو یہاں کے لوگوں کی غوث اعظم سے گہری عقیدت پر دلالت کرتا ہے۔ اس نسخہ کے مصنف عطاء اللہ فاروقی پتلادی ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے محمد کے لیے اس کا اختصار کیا تھا خود محمد اس کے کاتب ہیں اور نسخہ ۱۰۷۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔

ملک احمد بن پیر محمد فاروقی نے ایضاح المطالب شرح تذکرۃ المذاہب ۱۰۶۱ھ میں قصبہ پتلادہی میں مکمل کیا تھا۔ ممکن ہے ملک احمد پتلاد کے ہوں اور احمد آباد میں مقیم ہو گئے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۸۔ شیخ عبدالعزیز بن ولی نے مناظرہ پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام عزیزیہ ہے۔ یہ نسخہ کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ میں ہفت رسالہ کے ساتھ مجلد ہے[2]۔ اس کے حاشیہ میں بھی ملک احمد نے اپنی تعلیقات درج کی ہیں۔

۹۔ العقد اللآلی : ۱۰۸۰ھ میں ملک احمد نے اس کو مکمل کیا[3]۔ اس کا ایک نسخہ رایل ایشیاٹک لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے۔ یہ بھی حاشیہ میں ہے مصنف کہتے ہیں:

فیقول العبد الفقیر المعترف	فقیر وعاجز پر تقصیر اور گنہگار بندہ
بالعجز والتقصیر الغریق فی	ملک احمد بن پیر محمد فاروقی عرض کرتا
بحار المعاصی الخائف من یوم	ہے کہ میری یہ تعلیقات علامہ تفتازانی
یوخذ فیہ بالنواصی الراجی	کی شرح عقائد اور حاشیہ خیالی پر ہیں
للطف الملک الغفور التقی	اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں صحیح

[1] نمبر ۱۳۵/۸ [2] ۱۷۷/۱۹ [3] کال نمبر ۱۹ء۔

ملک احمد بن پیر محمد الفاروقی	طور پر مکمل کرا دے اور انہیں میرے
اغناہ اللہ عما سواہ واوصلہ	لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، میں اس فن
الی ما یرجیہ واعطاہ ما یرضیہ	میں قلیل البضاعت اور نا قابل شمار
ووفقہ شکر ما اعطاہ۔ ان	ہوں، اگر کوئی صاحب میرے زلات
ھذہ خرازات علقتھا وھذیانات	قلم کی اصلاح فرما دیں گے تو یہ انکا
نمقتھا علی شرح العقائد	احسان ہوگا، بلاشبہ اللہ اصلاح کرنے
للعلامۃ التفتازانی وحاشیۃ	والوں کے اجر کو ضایع نہیں کرے گا۔
الفاضل الخیالی تغمدھما اللہ	
برضوانہ واوصلھما الی	
ما یطلبانہ رجاء من اللہ	
ان یتمھا علی منھج الصواب	
ویجعلھا ذخر الیوم المآب	
انی فقیر قلیل البضاعۃ غیر	
معد ودنی ھذہ الصناعۃ	
من وجد فیھا من الخطاء الخلل	
ووقف علی شئ من الزلل فلیصلح	
بقلم الاحسان فان اللہ لا یضیع	
اجر المصلحین ۔۔۔۔۔۔۔	

آخر میں ترقیمہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد اللآلی کی ابتداء عاشورا

۸۸۳ھ میں ہوئی۔ اسی سال وہ حج کے لیے تشریف لے گئے، ۸۸۴ھ میں ان کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ اسکے بعد وہ اپنے وطن مالوف احمد آباد لوٹے اور ۲۱ ربیع الاول ۸۸۵ھ میں مذکورہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہونچی کیونکہ زیارت حرمین شریفین کی وجہ سے شرح نویسی کا کام التوار میں پڑ گیا تھا۔

اس نسخہ کے کاتب کا نام پڑھا نہیں جاتا۔ لیکن کاتب نے لکھا ہے کہ:

فرغت من الکتابة غرة رجب المرجب سنة تسعین والف یعنی ۸۹۰ھ میں کتابت ہوئی ہے۔ گویا سن تصنیف کے صرف پانچ سال بعد۔ اس کی کتابت خود مصنف کی زندگی میں ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ قدیم ترین نسخہ ہوا۔

۱۰- **زاد الاحباب فی مناقب الاصحاب**: ملک احمد بن پیر محمد الفاروقی کی اس کتاب کا ایک خوبصورت نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے[1]۔ اس کے اوراق پر صفحات نمبر نہیں ڈالے گئے۔ یہ ان کی آخری کتاب ہے جو ۹۰۱ھ میں لکھی گئی۔ کہتے ہیں:

فیقول العبد الفقیر الی الولی	بندہ فقیر و پر تقصیر احمد بن پیر محمد
النصیر المعترف بالعجز والتقصیر	فاروقی (اللہ اسے اپنے سوا دوسروں
والمقر بفضله الخطیر الغریق	سے مستغنی اور اپنی رضا کی توفیق دے)
فی بحار المعاصی الخائف من یوم	عرض کرتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں
یوخذ فیه بالنواصی الراجی	روافض کی کثرت ہے اور وہی ہمارے

---

[1] نمبر ۲۸۸۱۔

بلطف الملك الغفور التقی ملک	ملک پر حکمراں ہیں۔ انھوں نے اپنے
احمد بن پیر محمد الفاروقی اغناه	مسلک کی نشر و اشاعت کی اور چاہا
الله تعالی عما سواه واوصله	کہ اس کو نہایت مستحکم بنائیں تقیہ کو
الی ما یوجبه واعطاه ما یرضاه	طاق نسیان میں سجایا گیا۔ بعض لوگ
ووفقه لشکر ما اعطاه انه لما	ڈنکے کی چوٹ پر تشیع کا اعلان کرنے لگے۔
کثرت الروافضة فی زماننا و	یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے
والواعلی بلادنا ونشروا مذهبهم	بدلے گمراہی اور مغفرت کے بجائے
واظهروا ملتهم وقصدوا ان	عذاب کو خریدا۔ مذہب حق کو پس پشت
یجعلوا مشید الارکان وکادا لتقیة	ڈال دیا جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں
توضع فی زوایا النسیان فاخذه	طغیان میں بہتے رہے۔ بعض نے مذمت
بعض الناس بالرؤس والاعیان	سے کام لیا تاکہ فقرے بچیں، بعض
اولئك الذین اشتروا الضلالة	اندھوں کی طرح مذبذب ہو کر رہ گئے،
بالهدی والعذاب بالمغفرة	تو میرے استاد سید مرتضیٰ نے حکم دیا کہ
ونبذ وامذهب الحق وراء	خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے
ظهورهم کانهم لا یعلمون	بارے میں جو آیات بصراحت موجود
وتابوا عنه ولبقوا فی طغیانهم	ہیں اور صحیح احادیث میں جو وارد ہوئے ہے
یعمهون وداهن بعضهم انتهم	نیز صلحا اور اولیاء کے اقوال وغیرہ سے
تمنیا للمیلة واستنکفا عن الفقر	استفادہ کرتے ہوئے روافض و خوارج
وتجبر بعضهم وصاروا بین	کے طعنوں کا جواب دوں تاکہ عوام کو

ذالک من بذ بین فاد تحملوا
وکانوا اقوما عمین امر فی الاستاذ
المشفق والمحب المرفق السید
المرتضیٰ تغمدہ اللہ تعالیٰ
بالرضا ان افرض ماورد فی الخلفاء
العظام والصحابۃ الکرام من الآیات
الصراح والاحادیث الصحاح
وماصدر فیھم من الآثار و
اقوال العلماء وما قال بعض
الصلحاء والاولیاء وابین اجوبۃ
ماطعن بہ فیھم الروافضۃ
والخوارجۃ خذ لھم اللہ تعالیٰ
فی الدنیا والآخرۃ لیکون
ذالک ھدایۃ للعوام وتذکرۃ
للاعلام۔

ہدایت ملے اور خواص کی یاددہانی
ہو سکے۔

بعد میں وہ کہتے ہیں:

فعرضت بحضرتہ ان ھذا
امر جلیل الشان طویل البیان
لایبلغ الیہ استطاعتی ولا

میں نے اپنے استاذ سے عرض کیا کہ یہ
تو ایک بہت بڑا کام ہے جو میرے
جیسے قلیل البضاعت کی استطاعت

یفی بہ بضاعتی ویعسر علی جمع
الکتب والرسائل ولا یساعد
الوقت فی جمع تلک الفضائل فقال
السعی منک والاتمام من اللہ
تعالیٰ ولا امر اھم واعظم مما سواہ
ثم لما مضی علی ذالک برھۃ
من الزمان سمع ذالک السید
نداء الرحیم الرحمٰن فبادر الی
اجابۃ نداء الملک المنان
وکان ھذا فی شھر المبارک
رمضان فی سنۃ سبع وستین
والف۔ ھیھات لایاتی
الزمان بمثلہ ان الزمان
بمثلہ لبخیل۔

سے باہر ہے میرے لیے کتابوں اور رسائل
کا جمع کرنا بھی دشوار ہے مجھے وقت بھی
میسر نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ تم
کوشش تو کرو۔ اتمام اللہ تعالیٰ کے
ذمہ ہے، کیونکہ موجودہ حالات میں
اس سے اہم اور بڑا کام کوئی نظر نہیں
آتا۔ کچھ دنوں کے بعد رمضان المبارک
۱۰۶۷ھ میں انہوں نے داعی اجل کو
لبیک کہا۔

اس عبارت سے جہاں ان کے استاد سید مرتضیٰ کا نام معلوم ہوا وہاں انکے سنِ وفات کا پتہ بھی چلا۔ اس سے زیادہ ان کا کوئی حال نہیں ملا۔ آگے لکھتے ہیں:

فکثیرا ما یختلج صدری ویدور
فی خلدی ان امتثل ما امرنی
واذکر ما نسینی لکن عوائق الزمان

استاد کی تعمیل ارشاد کا خیال ہمیشہ
دل میں رہا، لیکن نامساعد حالات کا
ہجوم رہا اور اسی اثنا میں ہندوستان ۔

قد كثرت وبوائق الدور وان
قد عظمت واحاط الفتن بلاد
المعمور بل آفاق العالم و
انتشر القتال فى اولاد آدم
ضاعت العباد و بارت البلاد
و بخلت السماء على الارض و
ترك النفل والفرض وعمرت
القبور وخربت القصور بالجملة
قد تغيرت الاحوال و الله
اعلم الى يوم المآل وكل ذالك
على مقتضى سيد المرسلين . . .
انا من نوم الغفلة و غشيان
النعس لة اذا يقظنى بشير الموت
واصحابى نذير الفوت والقى
الشيب على وجهى . . . فالهمت
ان امتثل ما امرنى وا جعل
من زاد المعاد لعل الله يقبله و
خير الازواد فاستخرت الله وطلبت منه
الرشاد والسداد فاذا نه
المعطى بفضله ما اراد وسميته

بلکہ پورا عالم فتنہ و فساد میں مبتلا ہوا
بنی آدم اور ملک تباہ ہوتے گئے۔ نوافل
و فرائض ترک ہونے لگے۔ غرض زمانہ
دگرگوں ہونے لگا . . . خود میرا بڑھاپا
آدھمکا تو مجھے ہوش آیا کہ میں نے بے شمار
گناہ کئے ہیں اور پاس کچھ بھی زاد معاد
نہیں۔ اس طرح گویا مجھے الہام ہوا کہ
اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کر کے اپنے
لیے توشہ آخرت مہیا کردوں۔ لہذا
استخارہ کرنے کے بعد اس کتاب کی
تصنیف شروع کی اور اس کا نام
زاد الاحباب فی مناقب الاصحاب رکھا۔
جو ایک مقدمہ سات ابواب اور تکملہ
پر مشتمل ہے۔

بزاد الاحباب فى مناقب
الاصحاب ورتبته على مقدمة
وسبعة ابواب و تكملة۔

گو اس کتاب کی ابتدا اواخر شعبان ۱۰۶۹ھ میں یعنی سید مرتضیٰ کے انتقال کے دو سال بعد ہو گئی تھی مگر تکمیل بوقت عصر بروز جمعرات ۱۰۹۰ھ میں ہوئی۔ غالباً یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔ کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کی فہرست نویسی کے درمیان راقم الحروف کو ایک مختصر رسالہ مسمیٰ بہ شجرہ[1] حضرت مخدوم شیخ احمد ملا جس کا سن کتابت ۱۰۹۰ھ ہے، اس میں ایک جگہ ملک احمد کو مرحوم لکھا ہے۔

کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ میں ملک احمد بن پیر محمد کے کتابت کیے ہوئے بعض نسخے بھی ہیں۔ جن میں ایک حاشیہ شرح وقایہ[2] مصنفہ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی ہے۔ اس کے حاشیہ پر ان کے پوتے سید حیدر کی تعلیقات بھی ہیں۔ ملک احمد نے اپنی ماں کے ماموں یعنی عبد العزیز بن ولی کے رسالہ عقاید الایمان کی بھی کتابت کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے ان دونوں بزرگوں سے انہیں خاص تعلق تھا۔

ڈاکٹر زبید احمد صاحب[3] نے اپنی کتاب (THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE) کے دوسرے حصہ کی فصل پنجم میں جو علم الکلام عقائد اور متفرق دینی موضوعات سے متعلق ہے، ملک احمد کی عقد اللآلی الغاشیہ فی حاشیۃ الشرح و شرح الحاشیہ کا ذکر ان دس کتابوں کے تحت کیا ہے جن کا زمانہ تصنیف نامعلوم یا مشتبہ ہے۔ یہاں فاضل مصنف سے تسامح ہوا ہے،

---

[1] نمبر ۲/۸ [2] ۱۳۸/۶ [3] صفحہ ۳۵۲۔

کیونکہ اس کا سن تالیف موجود ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ نیز مصنف کو ملک اللہ داد احمد آبادی بن ملک پیر محمد فاروقی کہا ہے جو غلط ہے۔

موصوف نے اسی حصہ کی فصل ہشتم میں جو تاریخ و سوانح و جغرافیہ سے متعلق ہے۔ ملک احمد کی زاد الاحباب کا سرسری ذکر اس طرح کیا ہے:

"ملک احمد بن ملک پیر محمد فاروقی (گیارہویں صدی ہجری) بہت جوشیلے سنی عالم تھے اپنے استاد سید مرتضیٰ (متوفی ۱۰۶۷ھ-۱۶۵۷ء) کی فرمائش پر مندرجہ ذیل کتاب لکھی تاکہ مسلمانوں کو اصحاب رسول بالخصوص خلفائے راشدین کے بہترین اوصاف اور کارناموں سے بخوبی آگاہ کیا جاسکے"[1]

زاد الاحباب میں انہوں نے روافض کے تغلب کا ذکر کیا ہے، یہ بات سنہ ۱۰۶۹ھ کی ہے جب کہ گجرات کا حاکم شاہجہاں کا بیٹا مراد بخش تھا، کیا وہ اور اس کے امراء شیعہ تھے؟ علاوہ ازیں تاریخ سے اس عہد میں تشیع کی ترویج کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ پھر انہوں نے ایسا کیوں لکھا؟ شاید زاد الاحباب کے مزید مطالعہ سے یہ عقدہ حل ہو۔ اگر مذکورہ تغلب سے مراد ہندوستان ہے تو یہ وقت شاہجہاں کی علالت کا ہے اور دارا شکوہ اپنے عقائد فاسدہ کی وجہ سے بدنام تھا، کیا اس سے اسی کی جانب اشارہ ہے؟ واللہ اعلم۔ رہا ہندوستان میں قتل و غارت گری کا ذکر تو یہ اشارہ شاہجہاں کے شہزادوں میں تخت نشینی کے باہم قتال کی طرف ہو سکتا ہے جو اس وقت پورے شباب پر تھا مگر زاد الاحباب کی تکمیل سنہ ۱۰۹۱ھ تک تو فیصلہ کن جنگیں لڑی جا چکی تھیں اور ملک میں امن قائم تھا۔ البتہ دکن میں شورشیں جاری تھیں۔

---

[1] صفحہ ۳۹۲۔

ملک احمد بن پیر محمد فاروقی کے اب تک جتنے مخطوطات دستیاب ہوئے ہیں وہ سب درسی کتابوں پر حواشی و شروح ہیں، ان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک استاد تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عربی میں کتابیں تصنیف کیں، فارسی میں انکی کوئی تالیف نہیں ملی۔ ان کی تمام کتابوں میں باستثناء شرح مطول سن تالیف درج ہے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عہد سنہ ۱۰۵۹ھ سے سنہ ۱۰۹۱ھ تک ہے۔ تفتازانی اور دیگر بزرگوں کی طرح انہوں نے بھی سب سے پہلے صرف و نحو کی کتاب الرشاد پر حاشیہ لکھا، انہیں فقہ معانی و بیان صرف و نحو مناظرہ عقائد علم کلام وغیرہ سے دلچسپی تھی، تفسیر و حدیث پر انہوں نے قلم نہیں اٹھایا۔ خدا بخش لائبریری میں پائے جانے والے زاد الاحباب کے نسخہ کی کتابت سنہ ۱۰۹۰ھ میں یعنی مصنف کی زندگی میں ہوئی۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے حواشی مشہور تھے۔ شہر کے علماء و فضلاء کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔ انہیں اپنی ماں کے ماموں شیخ عبدالعزیز بن ولی پہ ناز تھا۔ زاد الاحباب کے سوا ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں۔ ان کا دماغ ہمیشہ مختلف فرق باطلہ کے عقائد سے برسرپیکار رہتا تھا اور زاد الاحباب بھی اسی ذہنی کشمکش کا ثمرہ ہے۔ گو اس کا تعلق کسی ایک فرقہ کے ابطال سے ہے۔ وہ ایک اچھے کاتب بھی تھے۔ اپنی پسندیدہ کتابوں کی کتابت بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، انکی ایک کتاب فقہ میں حاشیہ شرح وقایہ اور دوسری عقائد میں ہے۔ گویا انہیں انہی علوم سے دلچسپی زیادہ تھی۔ ممکن ہے ان کی تعلیقات حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانہ کے علاوہ اور جگہ بھی ہوں۔

یورپی علوم کا عرب ورثہ

مترجمہ مولوی محمد ثناء اللہ عمری ایم۔ اے

"DR SIGRID HUNKE ایک جرمن خاتون ہیں، جو ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئیں فلسفہ، نفسیات، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، قرون وسطیٰ کی تاریخ اور جرمن زبان و ادب اور ثقافت ان کے خاص موضوعات ہیں، انہوں نے ستّرہ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے دو چار اسلام پر بھی ہیں، زیر نظر مقالہ بھی ان کی کدو کاوش کا نتیجہ ہے، جس کا انگریزی ترجمہ WOLFGANG HUBNER اور KATHERINE BIRD کے قلم سے سہ ماہی رسالہ UNIVERSITAS کے اپریل۔ مئی۔ جون ۱۹۹۲ء کے شمارے میں چھپا ہے جو جرمنی کے شہر STUTTGART سے شائع ہوتا ہے راقم نے قارئین معارف کی دلچسپی کے لیے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔" (م۔ ث۔ ع)

مغرب میں یونان و روم کو صدیوں تک یوروپی ثقافت کا بانی سمجھا گیا ہے، اہل یورپ کے خیال میں تمام ثقافتی، فنی اور سائنسی تاریخ، قدیم مصر اور بابل میں شروع ہوئی اور قرون وسطیٰ اور عہد جدید میں مسیحی دنیا کی طرف منتقل ہونے سے پہلے یونان اور روم میں ایک زمانہ تک رہی، مگر یہ عجیب بات ہے کہ ماضی اور حال کسی زمانے میں بھی جرمنی اقوام اور عربوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا، حالانکہ عرب ہمارے قریبی پڑوسی ہیں اور خطۂ ارضی پر پورے ساڑھے سات سو برس تک ان کی تہذیبی بالادستی قائم رہی، کیونکہ مغرب پر

اللہ کے سورج نے وقت کے تعصبات کا پردہ ڈال رکھا تھا۔

سنہ ۱۹۶۰ء تک ثقافتی تاریخ کے موضوع پر لکھی گئی سینکڑوں کتابوں میں سے صرف دو کتابوں میں عربوں کا ذکر کیا گیا ہے، سنہ ۱۹۵۹ء میں آرتھر کوسٹلر (ARTHUR KOESTLER) نے اپنی چھ سو صفحات کی ضخیم کتاب "DIENACHTWANDLER" میں عربوں کے لیے صرف دو ہی صفحے مختص کیے ہیں جس کا موضوع "دنیا میں علم کی ترقی" ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا وہ زخم ابھی تک ہرا ہے جو صلیبی جنگوں میں شکست کے نتیجہ میں عیسائیوں کو لگا تھا اس کا اہانت آمیز بیان ملاحظہ ہو:

"مگر عرب تو یونانی ورثہ کے محض حامل، ناقل اور محافظ تھے، وہ ایک محدود سائنسی جدت و اختراع کے مالک تھے، ان صدیوں کے دوران جب وہ اس خزانے کے اکیلے پاسبان تھے، انہوں نے اس سے کوئی نمایاں کام نہیں لیا، نظریاتی علم پر کچھ اضافہ نہیں کیا، ورثہ بے نتیجہ رہ گیا۔"

دراصل سب ہی ماضی کے ذہنی اور دماغی ورثہ کے حامل و ناقل ہیں، خود یونانی بھی اسی کے وارث تھے، انہوں نے مصر و بابل کے قدیم علوم کی توسیع کی، ان پر نئی عمارتیں کھڑی کیں اور ان کو اپنے خاص طریقہ و نہج پر ڈھالا، ان کی تبویب کی اس لیے انکو اور نیا اور اونچا درجہ ملا۔ ہندوستانی بھی وارث اور ناقل تھے، جنھوں نے اس علم کو مضبوطی سے تھام لیا جو انہیں پہنچا تھا اور اس علمی مواد کو مخصوص شکل دی، عرب ہندوستانیوں اور یونانیوں کے وارث اس طویل عرصہ کے بعد ہوئے جب کہ یونانی پھول کسی نئی بہار کو جنم دینے کے قابل نہیں رہا اور مرجھا گیا تھا۔

عربوں ہی نے بڑی دلچسپی اور شوق سے ان ویران عبادت گاہوں اور کتب خانوں

میں مدفون قدیم مخطوطات کو تلاش کیا جنھیں عیسائیوں نے تباہ و برباد کر ڈالا تھا، پرانے دستاویزوں کو مال غنیمت یا معاہدۂ امن کے تحت ملنے والے تاوان کے طور پر حاصل کیا تھا، اسطرح عربی، اسلامی ثقافت آٹھویں صدی سے تمام شعبہائے سائنس میں غیر محدود ترقی سے ہمکنار ہوئی

اس لیے عربی اسلامی ثقافت کو موضوع بحث بنانا مناسب ہوگا گو اس کی تشکیل میں صرف عربوں ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ ایران، شام، ہندوستان، مصر، بربر، فرانس اور اسپین کی بعض قومیں[1] اور وہ سب قومیں بھی شریک ہیں جو عربی زبان، مذہب اسلام اور عرب طرز فکر کی مضبوط تعمیری قوت سے متحد ہوئی تھیں اس لیے ہم رازی اور ابن سینا کو جن کے خاندان تین سو برس تک عرب سلطنت کے زیر سایہ رہے بسے تھے، اتنا ہی ایرانی النسل نہیں گردانتے ہیں جتنا آیزن ہاور کو جرمن، کنیڈی کو آئرش یا روزویلٹ کو ہالینڈی سمجھا جاتا ہے، جس طرح یہ سب امریکی ہی خیال کیے جاتے ہیں، اسی طرح رازی و ابن سینا کو جنم دینے والی ثقافت ایرانی نہیں عربی تھی جس نے فارسی نژاد لوگوں کو ابتدائی مدرسہ سے آگے تعلیم دے کر عربی تخیل کے سانچوں میں ڈھالا ان کی دماغی و ذہنی نشوونما کا سامان کیا۔

علم کے لیے جد و جہد اللہ کی عبادت ہے

عرب میں یہ ثقافتی نشوونما ہوئی کیسے؟ پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرما کر کہ "جو لوگ حصول علم کے لیے جد و جہد کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کی عبادت کرتے ہیں" حصول علم کو ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ قرار دیا۔ یہ موقف پال کی عیسائیت سے مختلف ہے جس نے جنت عدن میں آدم اور حوا (علیہما السلام) کے ارتکاب کردہ ابتدائی گناہ کے نقطۂ آغاز کو بنیاد بنا کر اعلان کر دیا کہ تحصیل علم ایک ملحدانہ اور غلط راستہ ہے اور مزید یہ کہ دانشمندوں کی دانشمندی اللہ کے ہاں

[1] VISIGOTHS -

مردود و مسترد ہے۔ مسلمان اپنے روزمرہ مذہبی فرائض مثلاً پنجوقتہ نمازوں کے اوقات کی تعیین، صفائی ستھرائی اور تیمارداری کی ضرورت وغیرہ ہر شعبہ میں علم کی توسیع کے طالب تھے، ہر مسلمان کا فریضہ تھا کہ عرب ثقافت[1] کے یہ بنیادی تقاضے پورے کرے۔ نوشت و خواند کی بامقصد اشاعت کے باعث عرب علاقوں کے ہر باشندے کی یونانی دستاویزوں کے تراجم اور نئی نئی تحقیقات تک رسائی کتب خانوں، اعلیٰ درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے ذریعہ تھی۔ اس کی بدولت ایک کالعدم ثقافت جو مایوں (MAYAS)[2] اور ازٹگوں (AZTECS)[3] کی ثقافت کی طرح دفن ہو جانے اور فراموش ہو جانے کے قریب تھی، نہ صرف یہ کہ بچا لی گئی بلکہ اپنی تمام توانائیوں اور قوتوں کے ساتھ باقی اور جاری بھی رکھی گئی۔

وہ عظیم ذہنی وسعت جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی عظیم رواداری سے مسلمانوں کو عطا کی کہ "وہ غیر مسلموں سے بھی علم سیکھنے میں دریغ نہ کریں، خواہ وہ چین کے باشندے کیوں نہ ہوں"۔ ذہنی تحریکوں کے قیام کا باعث ہوئی مثلاً بصرہ کے معتزلہ نے جن کے رہنما ابراہیم نظام نے "شک و شبہ کو حصول علم کی پہلی شرط" قرار دیا تھا، اقتدار اور اندھی تقلید کی مخالفت کی تھی اور تجرباتی سائنس کی بنیاد ڈالی تھی، یہ کام اس نے بڑے صبر آزما طریقوں سے بار بار اشیا کا معائنہ کر کے اس طرح انجام دیا گویا آنکھیں انہیں دیکھتی اور کان انہیں سنتے ہوں۔

یونانی اور عربی نظریہ کا فرق

بنیادی طور پر الگ الگ ڈھانچوں میں جو یونان اور

[1] یہ عرب ثقافت نہیں اسلامی ثقافت ہے [2] مرکزی امریکہ اور جنوبی میکسکو کی ایک قوم جو بڑی متمدن تھی [3] ہسپانوی فتح سے قبل میکسکو کی ایک باثر قوم

عرب کی علمی راہوں طریقوں اور نتیجوں کے مابین موجود ہیں، ہم ان دو سائنسوں کے درمیان جنھوں نے مغرب کو متاثر کیا ہے، ایک فیصلہ کن فرق پاتے ہیں۔

ایک طرف یونانی ذہن اپنی فطرت کے مطابق طبیعیاتی، منفرد، تغیر پذیر اور عیاں اشیاء سے اوپر اٹھتا ہے، اشیاء کے ایک عمومی، مستقل، پائدار اور دائمی کوہ اولیمپس (OLYMPUS)[1] تک مرتفع ہوتا ہے، مدہم تجربے کی غبار آلود راہ سے اونچا اٹھتا ہے، حواس کو فریب دینے والا تجربہ، حقائق کی دنیا سے بلند ہوتا ہے، جو ایک پر فریب نمود یا حادثہ کی حیثیت سے نظر آسکتا ہے، تصور محض کی ذہنی گرفت سے بھی بالاتر، نظریہ خالص کے میدان میں سب سے اونچے اصول پر جا پہنچتا ہے اور اس طرح نظریاتی طور پر ایک فطری فلسفہ کو جنم دیتا ہے، اس کے برعکس دوسری طرف عرب دماغ کی راہ ایک ٹھوس، محسوس، ننگے پاؤں سے چلی جانے والی راہ ہے جو منفرد حقائق کی دنیا سے ہوکر گزرتی ہے جو ایک متعین و مخصوص طریقہ سے ایک عام اور استقرائی طریقہ کی طرف ایک قابل اعتماد اور پوری طرح صبر طلب چڑھاؤ ہے، یہاں پیمائشوں سے حقایق کا احاطہ کیا گیا ہے، یونانی رجحان محسوس کے بجائے غیر محسوس کی طرف ہے، منفرد کو نظر انداز کرنے اور غیر مرئی نظریات کی طرف بلندی کا ہے، عرب کے لیے متعین اور منفرد اشیاء بالکل بیش یا افتادہ چیزیں ہیں۔

خاص طور پر عرب ایجادات قابل لحاظ ہیں جن کو عرب دماغ نے بغیر کسی امداد کے آزادانہ طور پر وجود بخشا، مغرب پر انکا غیر معمولی اثر ہوا، اگرچہ قدیم یونانی عہد میں جب کہ مشرقی علوم کی یونانی علوم میں پیوندکاری کی گئی، ایک نئے غیر یونانی فلسفہ کی

[1] متعدد نیہ کا ایک پہاڑ جس کی چوٹی پر یونانیوں کے عقیدے کے مطابق انکے دیوتا رہا کرتے تھے۔

نشوونما ہوئی جس نے فطری فلسفہ کی مزید شاخوں کی جگہ سائنس کو جنم دیا، مگر یہ دوبارہ نظری تحقیقات میں شامل کر لیا گیا۔

وہ عرب ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے بے شمار تجربوں کے ذریعہ انتہائی صبر و تحمل سے نقشے تیار کیے، قوانین کی تشخیص کی، نظریات کو جانچا اور درست کیا اور متبادل نظریات فراہم کیے، اس لیے کہ انہیں فکری آزادی حاصل تھی، غرض انھوں نے اپنے مخصوص فکری ڈھانچہ کی بنیاد پر ایک اہم سائنسی طریقہ دریافت کیا اور سائنس کی اہم شاخوں کی بنیاد رکھی

فن علاج میں عربوں کا شرف و برتری

آج جس طرح عرب طلبہ جرمن ڈاکٹروں کو طب پر لکچر دیتے ہوئے سنتے ہیں اور وہ ان بڑے دواخانوں میں داخل ہوتے ہیں جو جدید ٹکنالوجی سے آراستہ پیراستہ ہیں اور طب کے طالب علم کی حیثیت سے جراحی یا طبابت کا تجربہ حاصل کرتے ہیں، اسی طرح کا اتفاق اہل مغرب کو بھی عربوں کے ساتھ پیش آچکا ہے، وہ عربوں کے منظم طریق علاج سے عرب ڈاکٹروں کے زیر نگرانی آٹھ نو صدی پہلے واقف ہوئے، شروع شروع میں اس طریق علاج پر عمل کرنے میں اہل یوروپ کو بڑی دقت پیش آئی، مریضوں کو ہوسٹلوں میں رکھا جاتا تھا جہاں خداترس خواتین ان کی خبرگیری کرتی تھیں، طبی اداروں میں حاذق طبیبوں کی تعلیم و تربیت، ڈاکٹروں کی ایک جماعت کی سرپرستی میں فارغین طب کا رہنا، مریضوں کو اس زمانے کے جدید طرز کے دواخانوں میں ڈاکٹروں کی نگرانی اور علاج میں رکھنا یہ سب عربوں کی دین ہے جن سے عیسائیوں کو واقفیت ہوئی اور انھوں نے مشرق میں رہ کر ان کی قدر پہچانی، جس کے بعد ہی جدید ترقی یافتہ قسم کے دواخانے وجود میں

آئے (پہلی بار ۱۵۰۱ء میں سٹراس برگ[1] میں، ۱۵۱۷ء میں لیپ زگ میں[1]) ان کی زیادہ صفائی کا اہتمام کیا گیا، چھوٹے بڑے عرب شہروں میں موجود بے شمار غسل کے طرز پر حماموں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا، دماغی مریضوں کو طبیبوں کی نگرانی میں رکھ کر ان کا علاج کیا گیا، ورنہ اس سے پہلے ایسے بیماروں کو قیدیوں کی طرح پاگل سمجھ کر گھروں میں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا اور چھوت کے مریضوں کو عام مریضوں سے علیحدہ رکھا جاتا تھا، یونانی طب پر عربی طب نے یہ قیمتی اضافہ بھی کیا کہ عربوں نے متعدی بیماریوں کی نوعیت کی تحقیق کی اور اس طبی حقیقت کو پہچان لیا کہ طاعون، جذام، چیچک اور دیگر وبائی بیماریاں جو بسا اوقات آبادیوں کا صفایا کر دیتی ہیں نہ تو زہریلے بخارہیں جیسا کہ یونانی خیال کرتے تھے اور نہ عذاب الٰہی ہے جو دعا و تضرع سے دفع ہو جاتا ہے، جیسا کہ عیسائی سمجھتے تھے، بلکہ یہ سارے امراض چھوت سے پھیلتے ہیں، عربوں نے اس سلسلہ میں موثر امتناعی اقدامات کیے، مریضوں کو علیحدہ رکھا، خاص قسم کے ٹیکے ایجاد کیے اور دماغی مریضوں کا علاج بھی کیا۔

مغرب میں زخموں میں لامحالہ قابلِ قدر پیپ※ کو بڑھاوا دیا جاتا تھا۔ اور یہ صورت اخلاط اربعہ کی بابت یونانی طبی تعلیم کے عین مطابق تھی، بولوگنا کے ایک معالج ہوگو نے مصر میں پانچویں صلیبی جنگ کے دوران پہلی بار بغور دیکھا کہ عرب طبیب زخموں کا علاج کیسے کرتے ہیں، وہ نیم گرم شراب کو جس میں الکحل کا عنصر

---

[1] STRASBOURG اور LEIPZIG ....

※ یہ تعبیر سمجھ میں نہیں آئی، یہاں انگریزی میں COMMENDABLP PUS کا فقرہ استعمال ہوا ہے

زیادہ ہو تولید جراحت کے روکنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے لیے کھپچیاں استعمال کرتے ہیں اور آپریشن کے دوران بے ہوشی کی دوائیں کام میں لاتے ہیں تاکہ اس طرح عمل جراحی اور قطع اعضاء سے درد نہ ہو، یہ بات "بورگوگنونی ہوگو" کے لیے بالکل نئی اور نامانوس تھی، یہ بات بھی اس کے لیے نئی تھی، کہ عرب طبیب قطع اعضاء کے دوران خون کے اہم شرائین کو باندھ دیا کرتے تھے اور زخموں بلکہ پٹھوں تک کو سی دیا کرتے تھے، بہرحال شمالی اٹلی میں علاج معالجہ کے فن کو LUCCA کے باشندے ہوگو نے مزید ترقی دی۔ اس نے دافع عفونت طریقے اپنائے، زخموں کا ایسا علاج کیا کہ اس سے تولید جراحت رک جائے، خواب آور" ہوش ربا" نسخے آزمائے، کلیسا نے اس تمام سلسلہ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا، اسے جادو اور ٹونا قرار دیا، چنانچہ یہ عمل یہاں مقبول نہیں ہو سکا اور مزید صدیاں گزر گئیں، جن کے دوران زخموں کے موذی اثرات نے بڑی سے بڑی طبی جدوجہد کو ناکام کر دیا، مصیبت زدہ لوگ قسمت کے مارے، خواب آور دواؤں کی سہولت اور راحت سے محروم رہے تاآنکہ فیصلہ کن پیش رفت نہ ہو گئی۔

تاہم عربوں کے فن جراحی کے اعلیٰ معیار نے طب کی ایک اور شاخ کو جلا بخشی جو اس سے قبل خاص طور پر ناپسند کی گئی تھی اور طبیبوں کی مجالس نے اس کے نامناسب ہونے کا اعلان کر دیا تھا، لیکن اب اسے ایک معزز مقام مل گیا اور عمل تشریحی (SURGERY) کی ترقی تیز رہی، خاص طور سے عربوں نے مغرب کو عمدہ، واضح اور منظم کتابیں فراہم کیں جو جامع اور مرتب درسی و تدریسی مواد پر مشتمل تھیں اور جو طبی طالب علموں کی تمام نسلوں کے لیے کارآمد ثابت ہوئیں، ان کا

معیار و درجہ سترہویں صدی میں بوکریٹس[1] اور گیلن[2] کی کتابوں سے کم نہ تھا چنانچہ کولون COLOGNE کے قریب NETTESHEIM نامی شہر کے باشندے "اگرپا" AGRIPPA نے ۱۵۰۰ء کے آس پاس تسلیم کیا ہے کہ:

"فن علاج میں عرب اس قدر مشہور ہو گئے ہیں کہ وہ اس فن کے موجد سمجھے گئے ہیں اور وہ بڑی آسانی سے اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں، بو علی سینا، رازی اور ابن رشد کی کتابیں اتنا اونچا مقام حاصل کر چکی ہیں کہ ان سے بے نیاز ہو کر جس شخص نے علاج معالجہ کی جرأت کی اس کی بابت کہا گیا کہ وہ عام بہبود کو بگاڑ رہا ہے"۔

عربی کتابیں پریس کی ایجاد کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والی کتابوں میں پہلی ہیں۔ اکیلے رازی ہی کا انقلاب آفریں مخطوطہ "چیچک اور خسرہ" ۱۴۸۶ء اور ۱۸۶۶ء کے درمیان چالیس بار شایع ہوا۔ سترہویں صدی کے آغاز میں عرب طبیبوں کی کتابیں فرینک فرٹ[3] اور ٹوبنگن[4] یونیورسٹیوں کی نصابی کتابوں میں ایک خاص مقام رکھتی تھیں۔

اسے اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ ستر برس پہلے پی ایچ ڈی کے ایک عرب طالب علم نے جو قاہرہ کا باشندہ تھا اپنے مقالے میں جو FREIBURG یونیورسٹی میں داخل کیا گیا تھا، ایک اہم انکشاف کیا: اس سے پہلے اسپین کے باشندے مکائیل سروٹ[5] اور ہاروے[6] انگلستانی دوران خون کے انکشاف کے لیے شہرت پا چکے تھے۔ انہوں نے "گیلن" کی اس غلطی کی اصلاح کی کہ قلب کے مختلف حصوں میں

[1] HIPPOCRATES [2] GALEN [3] FRANKFURT AN DER ODER [4] TUBINGEN [5] MICHAEL SERVET [6] HARVEY -

باہم دگر سوراخ ہوا کرتے ہیں جن کے ذریعہ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ خون ایک حصہ سے دوسرے حصہ کی طرف منتقل ہوتا ہے، بہرحال مصر کے اس پی ایچ ڈی کے طالب علم[1] نے یہ حقیقت ثابت کر دی کہ "سروٹ" سے تین سو برس پہلے ابن نفیس[2] پہلا شخص تھا جس نے "گیلن" کی غلطی کی نشاندہی کی اور اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ دوران خون کا نظام پھیپھڑوں سے تعلق رکھتا ہے، ابن نفیس دراصل دمشق کا باشندہ تھا، قاہرہ کے ناصری دواخانے کا رئیس الاطباء اور طب کا معلم تھا۔

دواسازی کے بانی

یونانیوں کے ہاں دواؤں کی تجویز اور ان کی تیاری دونوں اب بھی طبیب کے گھر ہوا کرتی تھی، مگر انہوں نے دواؤں کی تعداد بہت ہی زیادہ بڑھا دی تھی اور ان کی تیاری کے ایسے نئے طریقوں کو ترقی دی تھی جن سے نت نئی دواؤں کی تیاری بالکل ممکن ہو گئی تھی مگر یہ طریقے بڑے طویل المیعاد تھے۔

عربوں نے تقسیم کار کا اصول پیش کیا، جس طرح طبی طلبہ کے لیے ضروری تھا کہ مطب کرنے سے پہلے امتحان کے لیے طبیبوں کی ایک جماعت کے سامنے پیش ہوں اور پیش ہونے سے قبل ایک نظریاتی اور عملی نصاب میں ید طولیٰ حاصل کر لیں، بالکل اسی طرح دواسازوں کے لیے بھی ناگزیر تھا کہ عملی تربیت کا کورس پورا کریں اور مطب شروع کرنے سے پہلے دواسازوں کے بورڈ کا مقرر کردہ امتحان دے لیں۔

عربوں نے سسلی کے تمام شہروں میں اس جزیرہ پر اپنی دو سو سالہ حکمرانی کے دوران دواسازی کے کارخانے قائم کیے، روجر ثانی[3] نے جو نارمن بادشاہ تھا

[1] ڈاکٹر محی الدین غنطاوی بحوالہ مولانا حکیم عبدالوہاب ظہوری عمری، صحیفہ، ص ۲۱۔ [2] پورا نام علاء الدین علی بن ابی الحزم قرشی (۱۲۱۱ء–۱۲۸۸ء) [3] ROGER II ۔

سسلی کے دونوں سلطنتوں پر حکومت کی تھی، اس نے طبیبوں اور دوا سازوں کیلئے عربوں کے قواعد پوری طرح اپنا کر انہیں قانونی شکل دی' آگے چل کر اس کے پوتے HOHENSTAUFEN کے شہنشاہ فریڈرک ثانی نے انہیں اپنے طبی قانون میں شامل کر لیا۔ اس طرح طبیبوں اور دوا سازوں سے متعلق عرب سسلی کے قواعد وضوابط سارے یورپ کے لیے نمونہ بن گئے' اور یہ کوئی عجوبہ نہیں کہ پودوں پر مبنی چودہ سو دواؤں میں سے اکثر عرب دوائیں براہ سسلی شمال کو آئیں اور اپنے ساتھ اپنے عربی نام بھی لے آئیں۔ اس کی مثال میں خود لفظ DRUG[1] کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مشہور عرب ماہر نباتیات ابن بیطار کی تحقیق و تدقیق اپنی آب و تاب میں یونان کے DIOSCURIDES سے بھی بڑھ گئی تھی' اس نے ان دواؤں کیلئے حیوانی اور معدنی خلاصوں اور جوہروں سے ایک واضح اور سائنسی شاہکار ایجاد کیا جس میں ان کے ناموں، استعمال کی ہدایتوں، متبادل مادوں اور دواؤں کی تجویزوں سے متعلق معلومات درج تھیں۔

ان کے ساتھ دوا کی عربی شکلیں بھی آئیں، مثلاً شربت (SYRUP) جو خود عربی لفظ ہے، دواؤں کی مقررہ خوراک، آنکھوں کے لیے قطرے (کی دوا) ٹکیے، میٹھے میوے، سونے چاندی کی تہوں میں لپٹی ہوئی ٹکیا جو تقویت قلب کے لیے ابوعلی سینا نے تجویز کی تھی، یا شکر کی تہوں میں لپٹی ہوئی ٹکیا تاکہ ان کی کڑواہٹ اور بدمزگی محسوس نہ ہو، عرب میں رائج کیمیائی دوا سازی ایک بالکل ہی نئے طرز کے علاج معالجے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔

[1] عربی اصلیت معلوم نہ ہوسکی۔

تجرباتی علم کیمیا کے موجد

اس میدان میں عرب سائنس کا امتیاز فوری طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

فلسفی کے پتھر کی تلاش' اس مادے کی تلاش جو جوانی، صحت اور عمر دراز دینے والا فرض کر لیا گیا ہے، جس کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ معمولی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر دے گا۔ مصر، یونان' ایران اور ہندوستان کے دانشور جس کی تلاش وجستجو میں لگے رہے، جس کا ذہنی تسلط عربوں اور عیسائیوں کے بھی استغراق کا باعث ہوا، غرض ہر چیز جو اس وقت تک پوشیدہ اشیاء کی نظریاتی تحقیقات تک محدود تھی، مخفی اشیاء سے متعلق یہ نظریاتی تحقیقات عربوں کے لیے ایک چیلنج تھیں، جسکا رخ عموماً عملی اطلاق اور دریافت طلب حقائق کی طرف تھا، جن کے لیے منظم تجربے اور مواد کے تجزیے درکار تھے اور جن کے علم و واقفیت اور امتیاز و وضاحت کے لیے سائنسی تجربہ گاہوں کی ضرورت تھی۔ اس سے ہماری مراد کیمیائی تجربہ ہے۔

چنانچہ نئے کیمیائی مرکبات اور نئے کیمیائی اعمال ایجاد کیے گئے جو مغرب میں پہنچے، جس کو اس وقت بنیادی طور پر کیمیائی فنون سے دلچسپی تھی، لیکن ابھی تک اس معاملہ میں بالکل بے بہرہ تھا، روجر بیکن[1] اور آرنلڈ ڈی ولانوا[2] کو اس سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے جنھوں نے کم از کم نظریاتی طور پر اپنے عرب رفقائے کار سے کیمیائی تجربے کا تصور اپنا لیا تھا، برطانوی مورخ CUSTOM کے بقول عرب تجربہ کاروں (EXPERIMENTERS) نے کیمیا (CHEM ISRRY) کو اس حد تک ترقی دی تھی کہ جدید نامیاتی (ORGANIC) اور غیر نامیاتی (INORGANIC)

[1] ROGER BACON [2] ARNOLD DE VILLANUEVA:

علم کیمیا کی دریافت ضروری تھی تاکہ اسے اس معیار سے ہمکنار کیا جائے جہاں تک عربوں نے اسے پہنچایا تھا۔

"عرب فن دوا سازی کے حقیقی موجد تھے، وہ عہد قدیم کے عام دوا فروشوں سے بہت آگے تھے" (سگرڈ ہنکی۔ "اللہ کا سورج مغرب پر")

یوروپی اقوام پہ عرب علم کیمیا نے جو اثرات ڈالے ہیں وہ آج بھی ان کی زبانوں اور فنی اصطلاحوں میں دکھائی دیتے ہیں، اکثر اصطلاحوں سے ہر دوا ساز اور ہر گھر والی خاتون واقف ہے۔

کیمیائی ایجاد اور نئے دور کا آغاز | علم کیمیا کا استعمال زندگی کے تحفظ کی خدمت تک محدود نہیں تھا بلکہ جنگ کے میدان میں بھی اسی کیمیائی صنعت نے مغرب کو بہت آگے کر دیا جس سے ایک نئے عہد کی بنیاد پڑی، لمبے نشان کے ہتھیاروں کی ایجاد نے زمینی جنگ کے لیے توپ اور زیر آب لڑائی کے لیے تارپیڈو سے جنگ کا خاتمہ کر دیا، عرب چینیوں کے ذریعہ بارود کی دھماکہ انگیز قوت سے واقف ہو چکے تھے، سنہ ۱۲۷۰ء میں فان چنگ نامی مقام[۱] پر منگولوں نے عرب سائنس دانوں کے علم سے استفادہ کیا تھا، عرب حکمرانوں نے جو صلیبی جنگوں میں حملہ آور عیسائیوں سے اپنا دفاع کرنے کے لیے مجبور تھے، مشہور کیمیا دانوں کا بارود کے کارخانوں میں تقرر کیا تاکہ کیمیائی ہتھیاروں کے دھماکہ پیدا کرنے والے اثرات کی تحقیق کریں۔

فن حرب پر لکھی ہوئی عربی کتابیں بھی جو مغرب تک پہنچیں "خودکار اور خود سوز" انڈوں کی کیفیت سے پر ہیں، ان سے آگ برستی تھی، اور گرج اور کڑک ہوتی تھی،

---

[۱] FANCHING

انہیں سب سے پہلا راکٹ کہنا چاہیے، لسانیات کے بعض ماہر اس لفظ کو بھی عربی الاصل بتاتے ہیں[۱]، ان کتابوں میں تارپیڈو کا بھی ذکر ہے جو دھماکہ انگیز مواد سے بھرے رہتے تھے، یہ مواد راکٹوں کے ذریعہ حرکت میں آتا تھا اور اس میں متعدد فتیلے ہوا کرتے تھے، روجر بیکن نے بھی فن حرب سے متعلق یہ کتابیں دیکھی تھیں۔

لمبے نشانے کے ہتھیاروں کا فن مغرب نے عربوں سے سیکھا، سنہ ۱۳۴۶ء میں انگلستان نے فرانسیسی نائٹوں (KNIGHTS) کو آخری اور مشہور بہادرانہ جنگ میں CRECY کے مقام پر نئے برتر اسلحے سے شکست دی، مگر عربوں کے بجائے عیسائیوں کو بارود کا موجد قرار دیا جاتا ہے یا للعجب۔

جو عرب سیاح، تاجر، ملاح یا صلیبی سپاہی کسی عرب سرزمین پر رہے وہ وہاں سے اپنے ساتھ قیمتی نئی چیزیں مغرب لے آئے، مثلاً المان سٹرومر[۲] نے اسپین سے آکر NURNBERG میں کاغذ بنانے کا پہلا کارخانہ قائم کیا، ایک اطالوی فلاویوگیو[۳] AMALFI شہر کا تھا، اس نے عیسائی دنیا کے سمندری سفر میں قطب نما کو رواج دیا، اس لیے اسے قطب نما کا موجد کہا گیا ہے، حالانکہ فی الواقع اس نے عرب ورثہ سے اخذ و استفادہ کیا تھا، بارود اور کاغذ کے معاملات کی طرح یہاں بھی عربوں کی روح ایجاد نے ایک چینی تصور کو ترقی دی تھی، سنہ ۱۲۶۹ء میں فلاویوگیو جا سے منسوب ایجاد سے پچاس برس پہلے ایک فرانسیسی PETRUS نے جو MARICOURT کا باشندہ تھا، وہ ارض مقدس سے واپس ہوا تو اپنی

---

[۱] عن العربية "راحة" والراحة باطن اليد او باطن الكف قاموس انگلیزی عربی

[۲] ULMAN STROMER [۳] FLAVIO GIOJA -

کتاب EPISTOLA DE MAGNETE میں مقناطیس کی بابت عرب تحقیقات کی جو رپورٹ پیش کی تھی، اس میں ایک قطب نما کا نقشہ بھی شامل تھا، یہ قطب نما عربی اعداد میں مختلف درجوں کی نشاندہی کرتا تھا جو مغرب میں دستیاب عربی اعداد کے پہلے نمونوں میں سے ایک تھا۔

اعداد کا فن عربوں نے نہایت نفیس آلہ اختیار کیا، یعنی نو عددی رمز اور صفر ہندوستانیوں سے لیے، وہ اعداد کو ہندوستانی اعداد کہتے ہیں، ہندوستانیوں نے رومیوں کی طرح "ایک کے اعداد" کو یکجا کرنے کے بجائے موقفی اقدار (POSITIONAL VALUES) کا نظام ایجاد کیا، اس میں نو اعداد اور صفر کو جگہ دی، اس میں عدد کا موقف اسکی قدر و قیمت متعین کرتا ہے مثلاً اکائی، دہائی، سیکڑہ وغیرہ، ان سے بڑے سے بڑے اعداد بھی لکھے جا سکتے تھے، مگر عربوں نے بہت جلد اس نظام کو ریاضیات کا ایک اٹوٹ حصہ قرار دیا اور اسے روزمرہ کے عملی استعمال کی صورت میں مدون کر دیا جو آج بھی ہمارے زیر استعمال ہے، عددی تخمینہ، الجبرا اور حساب کی ایجاد عربوں کی ریاضی میں عبقریت کی رہین منت ہے، اس میں الخوارزمی کو خاص طور پر بڑا امتیاز حاصل ہے، وہ خلیفہ مامون کا درباری تھا اور اس کا نام اور بنیادی کام دونوں ALGEBRA اور ALGORITHM کے لفظوں میں زندہ ہیں، یونانی علم ہندسہ کے طریق تخمین کے برعکس ہم آج بھی الجبرائی ریاضیات کو ترجیح دیتے ہیں، جس کی مدد سے مدور علم مثلث، ساٹھ عدد کی بنیاد پر کیے گئے خالص تخمینے کی تکمیل اور دائرہ کی شصت عددی تدریج ممکن ہو سکی، یہ وہ ترقیاں ہیں جو فلکیاتی تخمینوں اور زاویوں اور وقت کی تمام پیمائشوں کے لیے بڑی ہمہ گیر اہمیت

کی حامل ہیں۔

پیسا (PISA) کے لمبارڈ لیونارڈو[1] نے جو یورپی قرون وسطیٰ کا ممتاز ترین ریاضی داں تھا نئے عددی رسم الخط کو مغرب میں روشناس کرایا، ZERO کے لیے عربی لفظ صفر (خلو) اپنایا، اس سے لاطینی شکل "CEPHIRUM" ڈھالی، جو اطالوی میں CEFERO ہوا، فرنچ میں CHIFFRE اور جرمنی میں ZIFFER بن گیا، اسی لیونارڈو سے دو رقمی عدد لکھنے کا طریقہ رائج ہوا جس میں اتفاقاً جرمن زبان میں اکائی پہلے پڑھی جاتی ہے اور دہائی دوسرے نمبر پر (مثلاً ایک اور بیس) جو عربی کے طریقۂ نوشت و خواند کے مطابق ہے، یعنی دائیں سے بائیں عربی رمز X بھی ہے جو نامعلوم کے لیے بولا جاتا ہے، اسے عرب "چیز" کہتے تھے SCHAI "Sch" اسی کی مخفف صورت ہے اور قدیم اسپینی زبان میں X کے رمز میں تبدیل ہو گیا۔

فلکیات اور ہیئت میں عربوں کے کارنامے اگر کسی کو فلکیات میں عربوں کے کارناموں کی کچھ خبر نہ بھی ہو تو ستاروں کے ناموں اور فنی اصطلاحوں کی بڑی تعداد مثلاً ZENITH- (سمت الرأس) NADIR (نظیر السمت) AZIMUTH سموت جمع سمت THEODOLITE[2] — اور ALMUCANTAR المقنطر جو شوقین اور پیشہ ور ہیئت دانوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اس راز کو آشکارا کر دیتے ہیں سب سے زیادہ مشہور و معروف ثوابت اور سیاروں کے نام عربی ہیں مثلاً ALDEBORAN- الدبران- ALCOR – ALGOL[3] – BETELGEUSE- بیت الجوزاء RIGEL رجل VEGA النسر الواقع وغیرہ۔ آسمانوں کا مشاہدہ خانہ برو[ش]

---

[1] LEONORDO LOMBARD [2][3] ان الفاظ کے عربی ماخذ اور اصل معلوم نہ ہو سکے۔

صحرائی بدوؤں کے لیے بہت زیادہ عملی اہمیت رکھتا تھا تاکہ انہیں نمازوں کے اوقات اور یہ معلوم ہوسکے کہ وہ کس جانب رُخ کرکے ادا کی جائیں گی، ماہ رمضان کی تعیین کرسکیں اور علم ہیئت سے متعلق تختیاں تیار کرسکیں جو مغرب میں صدیوں تک استعمال ہوتی رہیں۔

عربی اعداد پر مشتمل عرب قطب نما کا نقشہ MARICOURT کے باشندے PETRUS کی کتاب "EPIS-TOLA DE MA-GNETE" میں درج ہے[1]
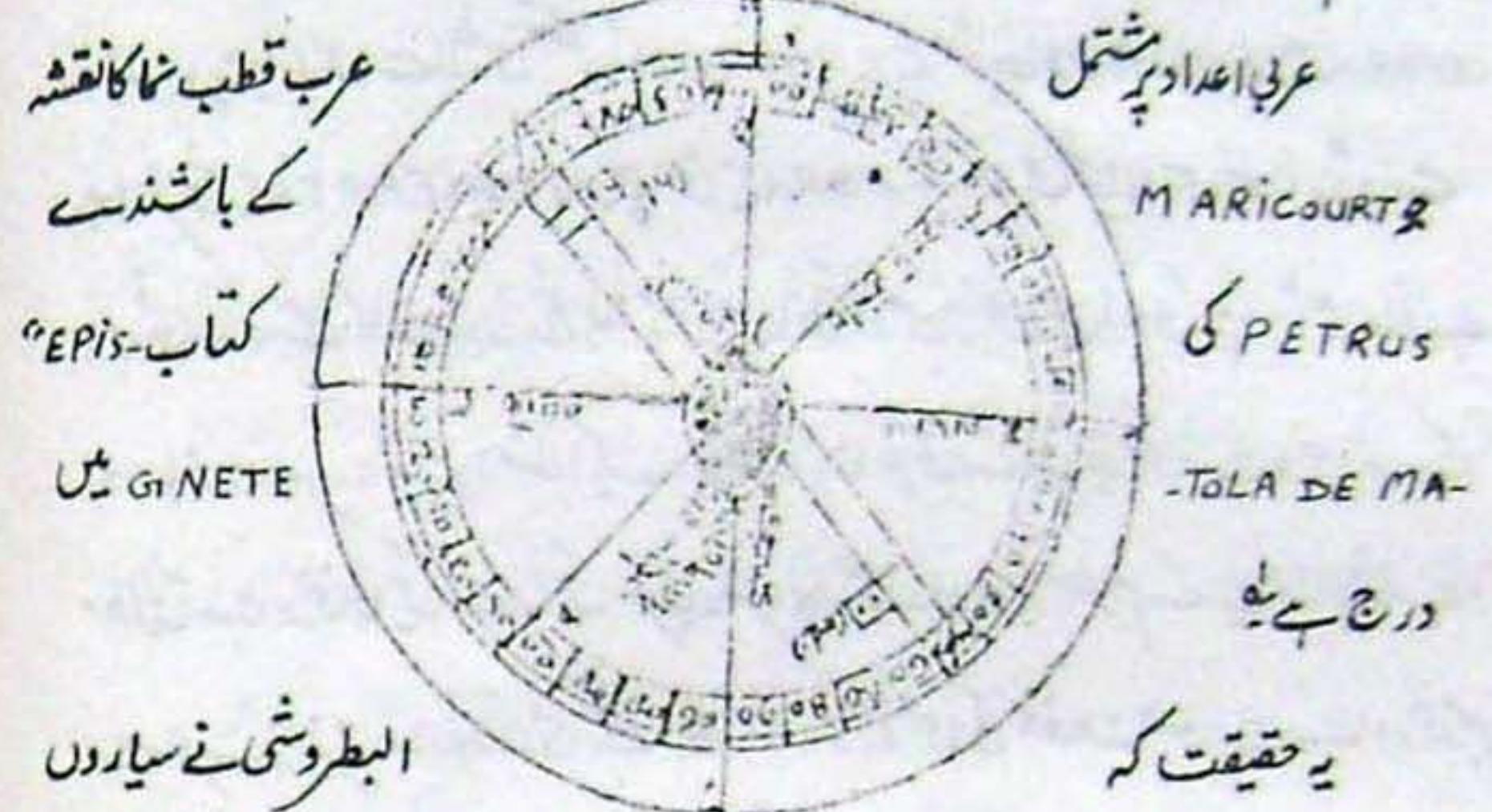
یہ حقیقت کہ البطروشی نے سیاروں کے مداروں کا معمہ حل کیا تھا، جس کے لیے یونانیوں نے بے سود مغز پاشی کی تھی، اسی کا حل کوپرنیکس[2] کے لیے رہنما ثابت ہوا، لیکن دنیا اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ کوپرنیکس سے پانچ سو برس پہلے البطروشی اس کی صراحت کرچکا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔

عربوں نے علم ہیئت کے آلات تیار کرکے اور انہیں ترقی دے کر اپنی غیر معمولی ذہنی قوت کا مظاہرہ کیا، یہ مختلف النوع آلات انہوں نے مغرب کے شہنشاہوں کو تحفے میں پیش کیے، خلوص و محبت کی بعض یادگار تحفوں اور عربوں کی مہارت کے نمونوں کا ذکر تاریخ میں محفوظ رہ گیا ہے جیسے "پانی گھڑی" اسے ہارون رشید نے فرانس کے بادشاہ شارلیمان کو تحفۃً بھیجی تھی اور پوری طرح آراستہ و پیراستہ ایک

[1] ماخوذ از "اللہ کا سورج مغرب پر" مولفہ سگرڈ ہنکی [2] COPERNICUS-

مشین جو سیاروں کے مداروں کی نقل و حرکت بتاتی تھی سلطان کامل نے HOHE-NSTAUFEN کے حاکم فریڈرک دوم کو ارسال کی تھی، سب سے اخیر میں مگر سب سے اہم وہ "سریلی گھڑیاں" تھیں جن میں ہر گھنٹے پر میکانیکی پتلے ایک گردش کرنے والی تختی پر رقص کناں رہتے تھے اور جو اہم یورپین شہروں کے ایوانہائے عام کی زینت بڑھاتی تھیں یا انتہائی پیچیدہ اور ذہانت کے زور سے تیار کی ہوئی ہیئت کی گھڑی جو BES-ANCON نامی مقام پر گوئٹے[1] کے والدین کے گھر پر تھی، علاوہ ازیں MUNSTER نامی مقام پر بھی عربوں کی متعدد یادگاریں ہیں جو اس حقیقت کی غماز ہیں کہ عربوں کو اس فن کی تیکنیک سے کتنی دلچسپی تھی اور وہ علم ہیئت سے متعلق پیمائشوں اور تخمینوں میں کس قدر صحیح اور صائب تھے۔

REICHENAU کے باشندے HERMANNUS CONTRACTUS کے ہاتھوں مغرب میں تعمیر شدہ رصدگاہ میں ہمیں عربوں کے طرز و انداز پر ربع دائرے (QUADRANTS)، سدس دائرے (SEXTANTS) اور ڈھانچے جیسے کرے ملتے ہیں جنھیں عربوں نے تین نئے دائروں سے مکمل کیا، ساتھ ہی ہر قسم کے اصطرلاب بھی یہاں پائے جاتے ہیں جو عربوں کی اختیار کردہ راہ پر مغرب کے ترقی کرنے سے پہلے تک رہے۔

بصریات کا آغاز

ابن الہیثم جو مغرب میں الہازن[2] مشہور ہے بصرہ کا ایک عرب تھا، جس نے سب سے پہلے افلاک کے مشاہدے کی روایت قائم کی، یہ مشاہدہ چشموں، عینکوں بشمول کیمرہ اور متعدد دیگر بصری آلات کے ذریعہ کیا جاتا تھا،

[1] مشہور جرمن شاعر [2] ALHAZEN-

جنہیں ہم آج بھی برت رہے ہیں، اس نے یونانی ورثہ میں ایک انقلاب پیدا کیا،
اس بنیادی علم و تحقیق کی بنا پر اسے بصریات کی سائنس کا بانی تسلیم کرنا چاہیے، اس نے
بطلیموس اور اقلیدس کی "نظری شعاعوں" والے نظریات کی اصلاح و تصحیح کی جن کے
مطابق فرض کیا جاتا تھا کہ روشنی آنکھوں سے پھیل کر اشیا پر پڑتی ہے۔" آنکھ سے نکلنے
والی شعاع روشنی کو جنم نہیں دیتی۔ زیادہ درست بات یہ ہے کہ مرئی چیز کی شکل آنکھ
میں روشنی ڈالتی اور اس کے شفاف جسم کے ذریعہ تبدیل ہوجاتی ہے۔" اس کی تحقیق
کے نتیجے میں ظاہر ہوا کہ وہ سیدھی راہ جو روشنی کی شعاعیں اختیار کرتی ہیں، سائے کا
پھیلاؤ مختلف طریقوں سے روشنی کا مسخ ہونا اور انعکاس ہے۔ اس نے ہر قسم کے آئینے، نور تکز،
عینکیں، ذرہ بین، شیشے اور خوردبین کیمرے کے بارے میں تجربے کیے جن کے باعث ابن الہیثم مغربی بصریات کا بانی ہوا۔

ابن الھیثم کا نقشہ چشم
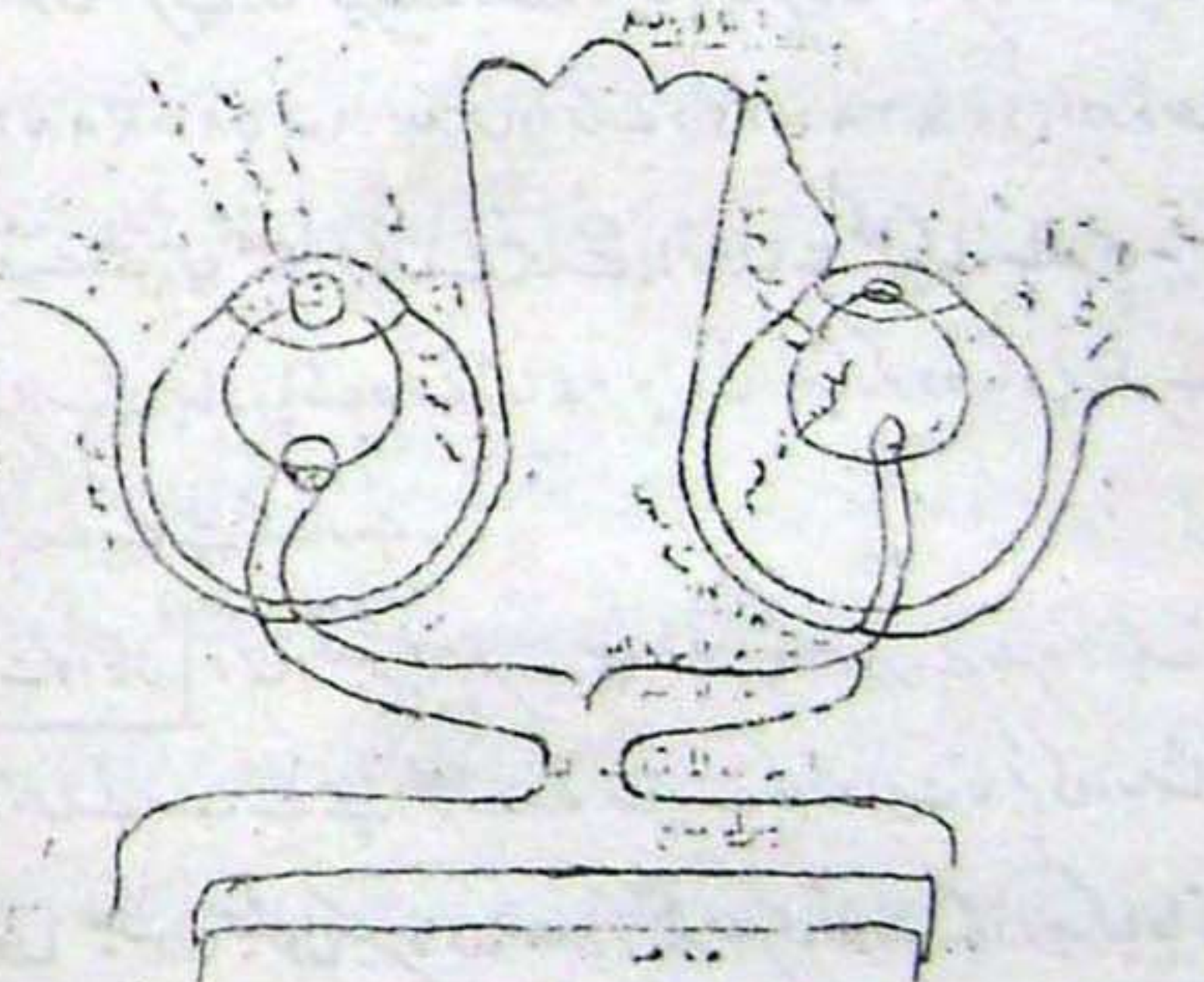
ابن الہیثم کی بصریات تجرباتی سائنس کی ابتدا ہے، اس نے اپنے تجربے کو
نظری سائنس کی حیثیت سے ترقی دے کر عرب محققین فطرت کی صفوں میں اپنی
جگہ بنائی اور تمام مغرب اس کا رہین منت ہوا

بوجوہ یونانیوں یا قرون وسطی کے علماء کے لیے منصوبہ بند تجربے تو در کنار فطرت کے
منفرد مظاہر بھی خالص مشاہدے یا عملیت کا موضوع نہیں تھے، اگرچہ ارسطو نے
صحیح علم کے سرچشمہ کی حیثیت سے وجدان کے برعکس عملیت کی اہمیت پہ زور
دیا، اس نے کسی حد تک "حقائق" پر بھی توجہ مرکوز کی اور قدیم العہد یونان میں منفرد
مشاہدوں کا ذوق بھی بڑی حد تک بڑھا۔

البتہ عربوں نے سب سے پہلے منفرد حقائق کو اپنی تحقیق کا نقطہ آغاز قرار
دیا اور استقرائی طریقوں کو عام اصول کی حیثیت سے اختیار کیا، علم ہیئت میں
انہوں نے بے شمار مشاہدوں اور پیمائشوں سے اشیار کا احاطہ کیا، اسی طرح
کیمیا اور طبیعیات میں بھی مختلف حالات کے تحت تجربے پیش کرنے کے لیے
غیر معمولی محنت و ریاضت کی، ان تجربات کو جانچے، نظریات کی اصلاح اور
نئے قوانین دریافت کرنے کے لیے بڑی مشقت جھیلی پھر ان قوانین اور نظریات کو
منضبط کرنے کے لیے ریاضی کا استعمال کیا۔

دراصل یہ سب سے قیمتی تحفہ ہے جو عربوں نے مغرب کے لیے چھوڑا ہے
یعنی تجرباتی فطری سائنس اسی سے مغرب کی علمی ترقی اور فطرت پر قابو پانے کی
راہ ہموار ہوئی اور ٹکنالوجی کی بنیادیں پڑیں۔

اقبال کے کلام میں "یقین" کی اصطلاح

از جناب محمد بدیع الزماں صاحب پٹنہ

"یقین" ایک قرآنی اصطلاح ہے جو ایمان کا ایک جزو ہے۔ قرآن میں "یومنون" اور "یوقنون"، دونوں اصطلاحیں وارد ہوئی ہیں اور یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اگر ہم ان دونوں کے اصطلاحی معنی، قرآن کی رو سے، ذہن نشین رکھیں تو اس اصطلاح سے ترتیب دئے گئے، اقبال کے کلام میں، جتنے اشعار ہیں آسانی سے گرفت میں آجاتے ہیں۔ یہ بات کہ "یقین" ایمان کا جزو ہے۔ اس کی نشاندہی قرآن میں بہت مواقع پر کی گئی ہے بلکہ قرآن سرچشمۂ ہدایت ہی ان متقیوں کے لئے ہے جو ایمان کے ساتھ یقین بھی رکھتے ہوں۔ جیسے صاف طور پر قرآن کے پہلے ہی جزو کی پہلی ہی سورۃ کے پہلے ہی رکوع آیات ۲ تا ۴ میں بیان فرما دیا گیا ہے اور ایسی ہی لوگوں کو اگلی آیت میں ہدایت یافتہ قرار دیتے ہوئے انہیں فلاح پانیوالوں کے زمرے میں شامل کئے جانے کی بشارت بھی دی گئی ہے۔

ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے اور یہ اعتماد ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہوتا ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے اس میں "یقین" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ ایمان اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اس کلی اعتماد کا نام ہے

جو یقینِ کامل سے پیدا ہوتا ہے۔ اقبال نے "بانگ درا" کی نظم: "طلوعِ اسلام" کے چوتھے بند کے درج ذیل شعر میں اس "یقین" کی ماہیت تمثیلی پیرایۂ بیان میں اس طرح ذہن نشین کرائی ہے ؂

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

"یقین" خارج سے درآمد کسی چیز کا نام نہیں بلکہ یہ اس حقیقت کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے۔ مگر یقین کی یہ کیفیت کسی کو خود بخود حاصل نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کو نشو و نما دے کر ابھارا جائے اور اپنی قوتِ ارادی کو کام میں لایا جائے اپنی ذات اور کائنات کا مطالعہ جہاں آدمی کو ایک طرف یہ بتاتا ہے کہ ایک عظیم خالق اور کارساز ہے جو اس کارخانے کے تمام واقعات کا حقیقی سبب ہے تو دوسری طرف اِس کے ساتھ اور اُسی وقت اس کو دو اور باتوں کا بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک اپنی انتہائی بے چارگی اور دوسرے خدا کے بے پایاں احسانات کا۔ اسے اس وقت اپنا وجود ہی مجسم احسان نظر آنے لگتا ہے اور وہ احسان مندی کے جذبے سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں اُسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ اس ہستی کو اپنا سب کچھ قرار دے جس نے یہ سارا انتظام کیا ہے۔ ان باتوں سے اوّلاً انسان کو اپنی بے بسی کا یقین ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کا یہ شدید احساس اور یقین کہ کوئی بلند تر قوت ہی اس کی دستگیری کر سکتی ہے۔ اسی نقطہ پر "یقین" ایمان کا جزو کامل بن جاتا ہے۔

یہ یقین اِس شعور کو بھی بیدار کرتا ہے کہ آدمی کو ان وعدوں پر بھروسہ رکھنا چاہئیے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل صالح اختیار کرنے والوں اور باطل کے بجائے

حق کے لئے کام کرنے والے بندوں سے کیا ہے اور انہی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ ان تمام فوائد سے اپنے کو محروم کرے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں۔ اور اُن سب نقصانات اور تکالیف کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اُس کے نصیب میں آئیں۔ ان باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ "یقین" کا گہرا تعلق ہے اور اس کے بغیر جو ایمان محض اعتراف اور اقرار کی حد تک ہو اس سے وہ شاندار نتائج حاصل نہیں ہو سکتے جن کا وعدہ اللہ نے "یقین" کرنے والوں سے کیا ہے۔

یقین ایمان کی وہ منزل ہے جو ایمان کو استحکام و ثبات عطا کرتا ہے۔ سورۃ الانعام ۶ کے رکوع ۹ میں حضرت ابراہیمؑ کے ایمان لانے کی تفصیل بیان فرمانے کے قبل اسی رکوع کی آیت ۷۵ میں ارشاد ہے:۔

"ابراہیم علیہ السلام کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو جائے"۔

حضرت ابراہیمؑ کا ضمیر لَا اِلٰہَ کی گواہی تو دے رہا تھا مگر انہیں تلاش اِلَّا اللہ کی تھی۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیت کے بعد ہی آیات ۷۶ تا ۷۸ میں اس تلاش کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ اور جب آپؑ کے دل نے اِلَّا اللہ کی گواہی دے کر آپؑ کو "یقین" کے منزل تک پہنچا دیا تو آپ کی زبانِ مبارک سے بے ساختہ طور پر "اِنِّیْ وَجَّہْتُ وَجْہِیَ لِلَّذِیْ....." کے کلمات صادر ہوئے جو کلمات آیت ۷۹ میں وارد ہیں اور جن کلمات کو پوری امتِ مسلمہ ہر نماز میں نیت کے قبل ادا کر کے نیت باندھتی ہے۔

اس لئے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پر ایمان لا چکنے کے بعد یہ کلمات ہی ایک مومن کو اس کے ایمان کے استحکام و ثبات کا یقین دلاتے ہیں۔

اقبال نے حضرت ابراہیمؑ کے اسی "یقین" کو "بانگِ درا" کی نظم "طلوعِ اسلام" کے پانچویں بند کے درج ذیل شعر میں "براہیمی نظر" سے موسوم کرتے ہوئے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں سورۃ الانعام ۶ کی آیات ۷۶ تا ۷۸ کی منظوم ترجمانی کی ہے ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

یقین ایمان کا جزو ضرور ہے مگر کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی دو منزلیں ہیں جن سے ایک مومن ایک کے بعد ایک گزر کر اس کلمہ پر استحکام و ثبات حاصل کرتا ہے۔ "یقین" کی وجہ سے استحکام و ثبات حاصل کرنے کو قرآن کی سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۶۰ میں "دل کے اطمینان" (یَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی کئی مثالیں قرآن میں وارد ہوئی ہیں۔ ایک مثال تو حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی منزل سے یقین کی منزل تک پہنچنے کی اوپر گذر چکی ہے۔ دوسری مثال بھی حضرت ابراہیمؑ ہی کے سلسلے میں چار پرندوں کو زندہ کرنے کے واقعہ کی سورۃ البقرہ ۲ کی اسی آیت ۲۶۰ میں دی گئی ہے جب آپؑ نے خدا تعالیٰ سے فرمایا کہ "میرے مالک، مجھے دکھا دے، تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے"۔ اس درخواست پر خدا تعالیٰ نے آپؑ سے استفسار کیا: "کیا تو ایمان نہیں رکھتا"۔ تو آپؑ نے عرض کیا: "ایمان تو رکھتا ہوں، مگر دل کا اطمینان درکار ہے" (وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ)۔ تب خدا تعالیٰ نے فرمایا۔

"اچھا، تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا
ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے پھر انکو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار و حکیم ہے"

قرآنِ پاک میں اس "یقین" کو ایک موقع پر دل میں داخل ہونے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ الحجرات ۴۹ کے رکوع ۲ میں ایک واقعہ کچھ بدویوں کے ایمان لانے کا بیان فرمایا گیا ہے جس سے ہم ایمان و یقین کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ سکتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ بدوی ایمان لا چکے تھے "خدا تعالیٰ نے رسول اللہ صلعم کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

یہ بدوی کہتے ہیں کہ "ہم ایمان لائے"۔ ان سے کہو، تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ یوں کہو کہ
"ہم مطیع ہو گئے وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل
نہیں ہوا ہے۔ (وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ)

ایسی ہی چند مثالوں کے پیشِ نظر جن سے "یقین" کی ماہیت سامنے آتی ہے اقبال کے درج ذیل اشعار کو گرفت میں لایا جا سکتا ہے جو علی الترتیب "بالِ جبریل" کی غزل ۲۲ اور "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے دوسرے بند کے ہیں

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لَآ اِلٰہَ اِلَّا ۔۔۔ لغت غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا ۔۔۔ اتر گیا جو ترے دل میں لَاشَرِیْکَ لَہٗ

قرآنی معنوں میں "یقین" کی ماہیت گرفت میں لا چکنے کے بعد اس اصطلاح سے ترتیب دیے گئے اقبال کے اشعار کے معنیٰ نہاں تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس اصطلاح سے ترتیب دیا گیا ایک شعر تو مضمون کے شروع میں گزر چکا ہے جس میں اس کی خاصیت یہ بتائی گئی ہے کہ: "بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی"۔

ان ہی قرآنی معنوں میں اس اصطلاح سے ترتیب دیا گیا دوسرا شعر "بانگ درا" کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کے پانچویں بند کا درج ذیل شعر ہے جس میں اقبال "یقین" کو "نقطۂ پرکارِ حق" قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقین ۔۔۔ اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

مگر اسی بند کے بعد ہی کے شعر میں اقبال اس یقین کو مومن میں عقل اور عشق دونوں صفات کے اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں جلوہ گر ہو کر اس دنیا کی ساری رونق اسی کے دم سے وابستہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ ۔۔۔ حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

اقبال کے کلام میں خود ان کی وضع کردہ اصطلاحوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا پہلے شعر میں اس "یقین" کو "مردِ خدا" کا یقین بتایا گیا ہے جو اصطلاح کے ان کے نظام تسمیہ میں مردِ مومن کا ایک روپ ہے۔ جو عشقِ رسول صلعم کا مظہر ہے اور اس کا ہر عمل اسی عشق سے فروغ پاتا ہے اور اس کے ہر نقش میں رنگِ دوام اور ابدیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ "مردِ خدا" کے اوصاف اور خصائص کو "نقطۂ پرکارِ حق" کی ترکیب کے پس منظر میں "مسجدِ قرطبہ" کے دوسرے بند کے اس شعر سے بہتر طور پہ گرفت میں لایا جا سکتا ہے ؏

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ ۔۔۔ عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

"مردِ خدا" کی ترکیب سے ترتیب دیا گیا اقبال کے کلام میں دو ہی اشعار اور ہیں جن میں ایک "بالِ جبریل" کی غزل ۲ (دوم) اور دوسرا "ضربِ کلیم" کی نظم "ہندی اسلام" میں ہیں۔

"یقین" کی اصطلاح سے ترتیب دیا گیا تیسرا شعر "بال جبریل" کی غزل ۱۸ کے اس قطعہ بند میں ہے :-

اک شرعِ مسلمانی، اک جذب مسلمانی — ہے جذبِ مسلمانی سرِّ فلک الافلاک
اے رہروِ فرزانہ بے جذب مسلمانی — نے راہِ عمل پیدا، نے شاخِ یقیں نمناک
رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی — ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک

اب یہاں شاخِ یقین نمناک ہونے کی شرط اقبال نے "جذبِ مسلمانی" کی لگا دی جو چنداں تشریح طلب ہے ۔ اقبال کے کلام میں "مسلمانی" الگ اصطلاح ہے جس سے قریب پندرہ اشعار ہیں ۔ "مسلمانی" کی اصطلاح سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ دینِ اسلام صرف عقائد کا نام نہیں بلکہ عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے ۔ یعنی اسلام عقیدہ کے لحاظ سے تو خالص ہے ۔ مگر عمل کے اعتبار سے نام ہے جہادِ پیہم کا ۔ اسی لئے وہ "نے راہ عمل پیدا" کی بات بھی ساتھ ساتھ کرتے ہیں ۔ "جذب مسلمانی" سے مراد شریعت کا باطنی پہلو ہے ۔ چونکہ دینِ اسلام دو چیزوں کا نام ہے یعنی شریعت اور طریقت کا تو صرف ارکانِ اسلام کی پابندی سے شریعت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ ایک چیز تو ارکانِ اسلام کی پابندی ہے جسے وہ "شرعِ مسلمانی" کہتے ہیں ۔ مگر اس سے بالاتر درجہ وہ "جذبِ مسلمانی" کو دیتے ہیں جو عشق و محبت کا مقام ہے ۔ اور جب مسلمان اسے حاصل کر لیتا ہے تو فلک الافلاک یعنی ساری کائنات کے اسرار و حقائق اس پر کھل جاتے ہیں اور شاخِ یقین کی نمناکی کے ساتھ راہِ عمل بھی متعین ہو جاتی ہے ۔ اس "جذبِ مسلمانی" کی وضاحت اقبال نے "اسرارِ خودی" میں اس طرح کی ہے :-

"انا" کا استحکام عشق ہی سے ہوتا ہے ..... "انا" کے استحکام کے لئے ہمیں "عشق" یعنی جذب کر لینے والے عمل کی طاقت کو نشو و نما دینا چاہیئے ۔ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی سیرت میں جذب کر لینے والے عمل کا سبق موجود ہے اور خصوصاً ایک مسلمان کے لئے ۔"

اقبال کے کلام میں "مسلمانی" کی ضد "نامسلمانی" بھی ایک اصطلاح ہے جس سے کلام میں کل دو اشعار ہیں جو دونوں رباعیوں میں ہیں ۔ ایک "بال جبریل" کی رباعی ہے اور دوسرا "ارمغان حجاز" کی رباعی ہے ۔

اب ان تشریحات و توضیحات کے بعد جب ہم "یقین" کی اصطلاح سے ترتیب دیے گئے متذکرہ بالا تیسرے شعر پر نظر کرتے ہیں تو اقبال کو یہ نکتہ ذہن نشین کراتے پاتے ہیں کہ "جذب مسلمانی" ہی ہے جو کسی انسان کو عمل صالح کی راہ پر گامزن کرتا اور ساتھ ساتھ دل میں یقین کا رنگ پیدا کرتا ہے ۔

"یقین" کی اصطلاح سے ترتیب دیا گیا چوتھا شعر جو اسی "جذب مسلمانی" کا پروردہ ہے "ضرب کلیم" کی نظم "علم و عشق" کے درج ذیل تیسرے بند کا ہے جس میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ عشق ہی سراپا یقین ہے کیونکہ سلطنت اور حکومت، فقر اور دین یہ سب عشق ہی کے معجزات ہیں جو عناصر پر حکمراں ہیں اور یہ عشق ہی ہے جو ظن و تخمین کا ازالہ کر کے یقین کے اسباب پیدا کرتا اور انسان کے لئے کامیابی کے سارے دروازے کھول دیتا ہے ۔ خواہ وہ کامیابی دینی ہو یا دنیوی ۔ اس عشق اور جذب مسلمانی کی بدولت "یقین" کے فتوحات یہ ہیں :-

عشق کے ہیں معجزات، سلطنت و فقر و دیں / عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں / عشق سراپا یقین، اور یقیں فتح باب!

اسی عشق کے پسِ منظر میں اقبال نے "یقین" کی مثال حضرت ابراہیمؑ کی "بالِ جبریل" کی درج ذیل رباعی کے پہلے شعر میں دی ہے جو اقبال کے کلام میں "یقین" کی اصطلاح سے ترتیب دیا گیا پانچواں شعر ہے ؎

یقیں مثلِ خلیلؑ آتش نشینی / یقیں اللہ مستی خود گزینی

اس شعر کے پہلے مصرعہ کو پوری گرفت میں لانے کے لئے پہلے سورۃ الانبیاء ۲۱ کے رکوع ۵ اور سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷ کے رکوع ۴ کا مطالعہ ضروری ہے ورنہ اقبال جو نکتہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں اس کے معنئ پنہاں تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس مصرعہ میں اقبال نے یہ باور کرایا ہے کہ "یقین" نام ہے اللہ پر پختہ اعتقاد کا، جس کی بدولت، حق کی خاطر ایک عاشق اپنی جان کو اس یقین کے ساتھ خطرہ میں ڈال دیتا ہے کہ خدا اس کی حفاظت کرے گا۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال اس "یقین" کو "اللہ مستی" اور "خود گزینی" سے بھی موسوم کرتے ہیں جس سے مراد خدا کی ہستی پر کامل اعتماد اور پختہ اعتقاد کے ساتھ اپنی خودی کو اللہ کے رنگ میں رنگنے کیلئے (دیکھیں سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۳۸) ایک مومن اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح آتش نشینی، اللہ مستی اور خود گزینی سب اس "یقین" کے نتائج بن جاتے ہیں جن کا محرک صرف عشق ہے جس عشق کے متعلق سورۃ البقرہ ۲ کی درج ذیل آیت ۱۶۵ میں فرمایا گیا ہے کہ :-

ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔ (وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ) "یقین" کی اصطلاح سے ترتیب دیا گیا اقبال کے کلام میں چھٹا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۳۸ کا یہ شعر ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے / وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اس شعر میں اقبال کی خود وضع کردہ دو اصطلاحیں "درویشی" اور "فغفوری" آجاتی ہے جن پر شعر کو گرفت میں لانے کے لئے ایک سی روشنی ضروری ہے۔ اقبال کے نظامِ فکر میں "درویشی" نام ہے مکمل انسانیت کا مگر یہ ان کے لئے ایک منزل ہے مقصد نہیں کیونکہ یہ ان کی "قلندری" کا دیباچہ ہے۔ یہ ان کے یہاں ایک منظم، مربوط اور محسوس منصوبہ ہے جسے قلندری عملی جامہ پہناتی ہے اور یہ ایک صفت ضبطِ نفس کی بھی ہے۔ جب انسان اپنے نفس کو قابو میں کرکے اس پر حکمراں ہو جاتا ہے تو وہ لوگوں کے دلوں پہ حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ اقبال کے یہاں "درویشی"، سربزیری کی ضد ہے جو باوجود غریبی کے اپنی غیرتمندی کی وجہ سے بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ اس لئے کہ اس کی وجہ اقبال "بالِ جبریل" کی غزل ۶ (دوم) میں یہ بتاتے ہیں کہ ؎

آئین راز ہے مردانِ حُر کی درویشی / کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبتِ خویشی

فغفور فارسی لفظ ہے۔ یہ ایک بادشاہِ چین کا نام تھا۔ فغفور اصل میں فغپور تھا۔ فغ بمعنی بت اور پور بمعنی پسر۔ چونکہ اس کے ماں باپ نے اس کو بت کی نذر کر دیا تھا اس لئے اس کا یہ نام ہوا۔ مگر چین کے بادشاہ کا لقب خاقان تھا جو اقبال کے کلام میں الگ ایک اصطلاح ہے

جس سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ارمغان حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے دوسرے بند میں ہے جس شعر میں اقبال نے "فغفور" اور "خاقان" دونوں اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔

"فغفوری" اصطلاح لاکر اقبال "جذب مسلمانی" کے کمالات یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ بنی امیہ کے ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت میں حجاج بن یوسف کی قیادت میں چینی ترکستان کی فتح اور تختِ فغفور کو کچل ڈالنا اسی عشق کی وجہ سے تھا اور ایسی عظیم سلطنت کا درویشی کے سامنے جھکنا صرف اسی "یقین" کی وجہ سے تھا جو ان اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا۔

اقبال کے نزدیک "یقین" کا اطلاق افراد اور قوموں کی دنیوی زندگیوں میں ان بنیادی افکار پر بھی ہوتا ہے جن کی صحت اور صداقت پر وہ یقین رکھتے ہوں۔ یہ یقین ان افکار کے نشر و اشاعت کیلئے سب سے بڑا محرکِ عمل بن جاتا ہے۔ جب تک کسی فرد یا قوم کو اپنے بنیادی افکار کی صداقت پر یقین کامل نہ ہو کسی فرد یا قوم میں عمل کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسلئے اقبال مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اپنے اندر یقین پیدا کرنے کی تلقین "بانگ درا" کی نظم "طلوعِ اسلام" کے پانچویں اور چھٹے بند کے اشعار میں کرتے ہیں کیونکہ یقین ہی کی بدولت ان میں شانِ فقر پیدا ہو سکتی ہے اور اس فقر میں وہ طاقت ہے جب کہ بادشاہ بھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ "یقین" کی اصطلاح سے ترتیب دئے گئے ساتویں آٹھویں اور نویں اشعار ان بندوں میں یہ ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے — یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیرِ ملت ہے

الغرض "یقین" سے اقبال کی مراد اللہ کی ہستی پر یقین، آنحضرت صلعم کی رسالت پر یقین اور قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے پر یقین ہے یعنی دینِ اسلام کی صداقت اور حقانیت پر یقین۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک یہ یقین فقر کے لئے بمنزلہ سنگِ بنیاد ہے۔ اس اصطلاح کو لاکر اقبال نے امت محمدیؐ کو یہی تعلیم دی ہے کیونکہ جب انسان میں یقین کی صفت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ حضرت جبرئیلؑ کی طرح قدسی نفس اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہو جاتا ہے اسی نکتہ پر "یقین" سے ترتیب دیا گیا اقبال کے کلام میں "بانگِ درا" کی نظم "طلوعِ اسلام" کے چوتھے بند کا یہ دسواں شعر ہے ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس شعر میں اقبال کی ایک اور اصطلاح "روح الامیں" آگئی ہے۔ جس سے ان کے کلام میں یہ واحد شعر ہے۔ اس شعر کو گرفت میں لانے کے لئے سورۃ الشعراء ۲۶ کی آیت ۱۹۳ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جس سے اور جن معنوں میں اقبال نے یہ اصطلاح اخذ کی ہے۔ اس سورہ کے رکوع ۱۱ کی آیات ۱۹۲ اور ۱۹۳ میں حضرت جبرئیلؑ کو اس لقب سے نوازتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ وہ روح ہے جو رسول اللہ صؐ پر اس لئے اتری ہے کہ آپؐ ان لوگوں میں شامل ہوں جو خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو متنبہ کرنے والے ہیں۔ "یقین" کی ماہیت کو ذہن نشین

کرانے کیلئے "روح الامین" کی اصطلاح سے بہتر شاید، سوا اقبال کے کسی کے ذہن میں دوسری اصطلاح نہ آسکتی تھی اور نہ اس سے بہتر موزوں شعر۔

اقبال نے "یقین" ہی سے ایک اور اصطلاح "بے یقینی" وضع کی ہے جس سے ان کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی ایک رباعی کا یہ ہے جو "یقین" کی اصطلاح سے اگیارہواں شعر ہے ؎

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی۔

بے یقینی کے معنوں ہی میں اقبال نے ایک ترکیب "محرومِ یقین" وضع کی ہے۔ اقبال مسلمانوں کے "یقین" کی دولت سے محروم ہونے پر "ارمغانِ حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کی زبان پر یہ اشعار رکھتے ہیں جو اس اصطلاح سے ترتیب دیا گیا کلام کا بارہواں شعر ہے:۔

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما مرد آفریں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اقبال نے ساری عمر امتِ مسلمہ کو ایمان و یقین کا درس دیا اور بالکل آخری عمر میں اسی "یقین" کی ماہیت اور اس کی فتوحات پر "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے سترہویں بند کے درج ذیل شعر میں "یقین" سے ترتیب دے کر ایک اور اصطلاح "صاحب یقین" وضع کر کے یہ بات ذہن نشین کرادی کہ "صاحب یقین" "صاحب فقر" ہے اور اگر لاکھوں انسانوں میں ایک شخص بھی ایسا ہو تو وہ پوری جماعت میں جہاد کا ولولہ پیدا کر دیتا ہے اور جوان اور بوڑھے سب سر کٹانے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس اصطلاح سے ترتیب دیا گیا تیرہواں اور آخری شعر یہ ہے جو سارے مضمون کا لب لباب ہے ؎

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقین

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کا عربی کلام

از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب۔ بریلی۔

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی قیاساً سنہ ۱۱۵۵ھ کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد حضرت شاہ رحمت اللہ کئی سلاسلِ طریقت سے منسلک تھے اور اجازتِ بیعت بھی رکھتے تھے، حضرت شاہ نیاز احمد کی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ مولانا فخر الدین چشتی نظامی (متوفی ۱۷۸۵ء) کے دست حق پر بیعت ہوئے اور ان کے حکم سے بریلی وارد ہوئے۔ آپنے محلہ خواجہ قطب بریلی میں رہائش اختیار کی۔ آپ نے سلسلۂ درس شروع کیا۔ کثیر تعداد میں ملکی اور غیر ملکی طلبہ آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ آپ طلبا کی ضرورت کے مطابق کتابیں املا کرا دیتے تھے، وہی طلبا فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کتابوں کو اپنے ساتھ بلاد اسلامیہ میں لے گئے جس کی وجہ سے حضرت شاہ نیاز احمد کو اپنی حیات میں ہی غیر معمولی احتشام میسر ہوا۔ ان کا حلقۂ درس وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ حضرت شاہ نیاز احمد نے تمام عمر درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور مشاغلِ طریقت میں بسر کی۔

حضرت شاہ نیاز احمد کی اٹھارہ کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ان کتب یا رسائل کے علاوہ اور بھی تالیفات ہو سکتی ہیں۔ ان اٹھارہ کتب میں صرف انکا دیوان مشتمل بہ کلام فارسی و اردو شایع ہوا اور باقی کتب غیر مطبوعہ ہیں۔ غیر مطبوعہ کتب، اہل علم کی

نظر سے پوشیدہ ہیں۔ ان اٹھارہ کتب کے نام یہ ہیں: رسالہ شمس العارفین۔ فن عقائد وتصوف۔ زبان عربی و فارسی اشعار (۲) شمس العین۔ شرح شمس العارفین۔ زبان فارسی (۳) کشف العین شرح شمس العارفین زبان عربی (۴) نور العین۔ تتمہ شرح شمس العین (۵) مجموعہ قصائد عربیہ (۶) بیاض فارسی (۷) ملفوظات فارسی (۸) دیوان فارسی و اردو (۹) شرح قصائد عربیہ (۱۰) رسالہ راز و نیاز (۱۱) تحفۂ نیاز (۱۲) تسمۃ المراتب (۱۳) لیعرفون (۱۴) لیعبدون (۱۵) حاشیہ شرح چغمنی (۱۶) حاشیہ ملا جلال (۱۷) رسالہ منطق (۱۸) مجموعہ رسائل بعلوم مختلفہ۔

چونکہ مذکورہ بالا فہرست مختلف ذرائع سے تیار کی گئی ہے، جب کہ کوئی مخطوطہ میری نظر سے نہیں گزرا، لہذا کتابوں کے اسمار میں سہو تکرار اور التباس کا امکان باقی رہتا ہے۔

تاہم اس فہرست کتب سے حضرت شاہ نیاز احمد کے تبحر علمی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر گوئی کی طرف بہت مائل تھے اور عربی فارسی و اردو میں شعر کہتے تھے، ان کا دیوان متعدد بار شایع ہو چکا ہے جس میں فارسی و اردو کا کلام ملتا ہے، لیکن عربی کلام نہیں ملتا کیونکہ وہ دیوان میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے انکا عربی کلام نظروں سے پوشیدہ ہو گیا جس کو ایک علمی و ادبی محرومی سے تعبیر کرنا چاہیں ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ نیاز احمد کے عربی کلام کے نایاب ہونے کی وجہ سے یہ ذہن بننے لگا تھا کہ وہ عربی کے شاعر ہی نہیں تھے۔ مثلاً میرے مضمون "حضرت شاہ نیاز احمد نیاز" کے معارف اعظم گڈھ بابت نومبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہونے کے فوراً ہی بعد اسی ماہنامے میں محمد ایوب قادری (متوفی ۱۹۸۳ء) کا استدراک شائع ہوا جس میں انہوں نے حضرت شاہ نیاز احمد نیازؔ کے عربی کلام کی موجودگی کی تصدیق چاہی تھی۔ حضرت شاہ نیاز احمد کے خاندان کے ایک فرد مسعود حسین نظامی نے اپنے مضمون "تصانیف

حضرت شاہ نیازؔ بے نیاز بریلوی" مطبوعہ معارف اعظم گڈھ بابت مئی ۱۹۶۶ء میں حضرت شاہ نیاز احمد نیازؔ بریلوی کے عربی کلام کی نشاندہی کی، ان کا عربی شاعری میں تخلص اُمّی بتایا اور ان کے عربی خمسجات سے بند اخذ کرکے مثالیں پیش کیں، انہوں نے حضرت شاہ نیاز احمد کے "مجموعہ قصائد عربیہ" کے ایک خمسے کے متعلق جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہے یہ اطلاع دی کہ وہ مطبع رزاقی کانپور سے ۱۹۳۹ء میں حضرت شاہ محی الدین احمد (متوفی ۱۳۴۳ ہجری) بنیرہ و سجادہ نشین شاہ نیاز احمد نیازؔ بریلوی کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا (ص ۳۸۳) مجھے مسعود حسین نظامی نے مطبوعہ خمسہ ہذا کے سرورق کا عکس بھی دکھایا تھا۔ بہر حال حضرت شاہ نیاز احمد کے عربی کلام کی موجودگی کی تصدیق تو ہو گئی، لیکن ان کا عربی کلام جو "مجموعہ قصائد عربیہ" میں شامل کیا گیا تھا وہ بدستور پردۂ خفا میں رہا۔ میں نے حضرت شاہ نیاز احمد کے عربی کلام کی تلاش جاری رکھی اور تیس سال کے بعد ایک بیاض ہمدست ہوئی جس میں حضرت شاہ نیاز احمد کا عربی کلام بھی شامل ہے۔ بیاض کا نام "مجموعۂ قصائد" ہے۔ بیاض مجلد ہے۔ بیاض کے نصف سے زیادہ اوراق سادہ ہیں۔ کاتب کا نام حسام الدین ہے اور اس کا تعلق ضلع بجنور (یو پی) سے ہے۔ حسام الدین بجنوری نے شیخ انوار احمد کے حسب الارشاد بیاض میں عربی کلام نقل کیا۔ بیاض تاریخ کتابت سے عاری ہے۔ میرے خیال میں یہ نسخہ پون صدی سے زیادہ پرانا نہیں ہے، کاغذ ولائتی، چکنا اور دبیز ہے، ورق کی لمبائی ۴ا سینٹی میٹر اور چوڑائی ۹ سینٹی میٹر ہے۔ جدول ہے اور خمسجات کا ایک بند ایک صفحے میں ہے۔ روشنائی سیاہ اور کتابت عمدہ ہے، اس مخطوطے میں حضرت شاہ نیاز احمد کے کلام عربی کی تفصیل اس طور پر ہے:

خمسۂ اول: موضوع سخن منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ کل بند ۲۲ بین السطور

ترجمہ اردو بہ روشنائی سرخ۔

خمسۂ دوم : بہ سلسلۂ منقبت پنجتن پاک۔ کل بند ۲۱۔ بین السطور ترجمہ اردو بہ روشنائی سیاہ۔

خمسۂ سوم : حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مناجات کی تخمیس۔ کل بند ۱۱، بین السطور جگہ خالی ہے۔ اردو ترجمہ نہیں دیا گیا۔

"مجموعہ قصائد عربیہ" کے مندرجات کی جو تفصیل مسعود حسین نظامی نے اپنے مضمون (معارف اعظم گڈھ۔ مئی ۱۹۶۷ء۔ ص ۳۸۲۔ ص ۳۸۳) میں دی ہے اس کا مخطوطے کے مندرجات سے مقابلہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مخطوطے میں خمسۂ اول "مجموعہ قصائد عربیہ" میں خمسۂ دیگر ہے۔ اس فرق کے پیش نظر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ حسام الدین کے سامنے "مجموعہ قصائد عربیہ" کا نسخہ نہیں تھا۔ اس نے کسی دیگر ذریعہ سے حضرت شاہ نیاز احمد کے دو خمسے اور ایک تضمین بیاض میں نقل کی۔ اس وقت متن کے موازنے کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ مجھے حضرت شاہ نیاز احمد کا "مجموعہ قصائد عربیہ" یا مطبع رزاقی کانپور کا مطبوعہ نسخہ فراہم نہیں ہوا۔ تحقیق متن سے بعض حقائق سامنے آتے، لیکن مقام معذوری ہے کیونکہ مخطوطے سے موازنہ کرنے کے لیے کوئی مطبوعہ یا خطی نسخہ پیش نظر ہی نہیں ہے۔ مجموعہ خمسجات عربیہ کا نام "مجموعہ قصائد عربیہ" کیوں رکھا گیا، کیا مخطوطے میں ترجمہ اردو حضرت شاہ محی الدین احمد کا ہے، بعض ایسے سوالات ہیں جنکا جواب بہ حالات موجودہ ممکن نہیں ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مناجات کے نو اشعار ہدیٰ ڈائجسٹ دہلی بابت جون ۱۹۷۹ء میں بھی شایع ہوئے تھے (ص ۴۱) کاتب نے اپنا نام "الحاج غلام رسول یار محمد حسن رقم مالیگاؤں" تحریر کیا۔ اس نے وہ ذریعہ یا ماخذ نہیں بتایا جہاں سے اسکو مناجات کے نو اشعار ملے تھے۔ حضرت شاہ نیاز احمد کے سامنے مناجات ۱۱ اشعار تھے جن کو انہوں نے بطور خمسہ تضمین کیا تھا۔ مخطوط میں تضمین شدہ خمسے کا اردو ترجمہ نہیں ہے لیکن غلام رسول یار محمد کے کتابت شدہ نو اشعار کا اردو ترجمہ ہر شعر کے نیچے موجود ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسام الدین نے جس مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے سے خمسجات اور تضمین کو نقل کیا اس میں تضمین کا اردو ترجمہ نہیں تھا۔ لہذا حضرت شاہ نیاز احمد کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ عربی کلام کا وہ نسخہ بھی کہیں محفوظ ہونا چاہیے جس میں صرف خمسہ اول اور خمسہ دیگر کا اردو ترجمہ ملتا ہے اور تضمین کا نہیں۔

حضرت شاہ نیاز احمد کے عربی کلام کو عام کرنے کے لیے ان کے تمام عربی کلام کی اشاعت ضروری معلوم ہوتی ہے، اس سلسلے میں ان کے عربی زبان کے خمسجات کے ۴۶ بندوں کی نقل محولہ بالا مخطوطے سے حاصل کر کے پیش کی جاتی ہے[۱]۔ کیا عجب کہ اس کلام کی اشاعت کے بعد ملت نیازیہ کے افراد میں ترغیب پیدا ہو اور وہ حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کا وہ عربی کلام بھی شایع کرا دیں جو مندرجہ ذیل ۴۶ بندوں کے علاوہ ہے۔۔ نقل کلام :

مجموعہ قصائد[۲]

خمسۂ اول

---

[۱] اسوقت یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کا دیوان ان کا عربی کلام شامل کرنے کے بعد ہی شائع کرانا چاہیے۔ امید ہے اس سلسلے میں کوئی مثبت پیش رفت ضرور ہوگی۔ [۲] معارف: اشعار شاعر کی عربی شاعری پر قدرت کا ثبوت ہیں خیالات سے بحث نہیں۔

(۷)

من بحمدك يا علي نال الفلاح
يا علي الله عونا يا علي

جملة فوق الله من عين الصلاح
بغضكم يا سيد لبس الجناح

بالتفات منك همي ينجلي
تمہاری ذرا سی توجہ میں تمام غم میرے دور ہوتے ہیں

(۸)

للنبي المصطفى انت الاخ
يا علي الله عونا يا علي
حضرت نبی مصطفیٰ کے تم بھائی ہو
اے علی خدا کے مددگار اے علی

بالاسم الكريم انت الناصح
في صراط الحق انت الراسخ
خدا کے رستہ میں تم نہایت مضبوط ہو

بالتفات منك همي ينجلي
تمہاری تھوڑی سی توجہ میں بہت سے غم میرے دور ہوتے ہیں

(۹)

انتي يا سيد عقل المعاد
يا علي الله عونا يا علي

بالجمع الاولياء منك الرشاد
بالتفاتك كلهم نالوا المراد

بالتفات منك همي ينجلي
تمہاری ذرا سی توجہ میں تمام غم میرے دور ہوتے ہیں

(۱۰)

وارثه مثلك حمل النفاذ
يا علي الله عونا يا علي

من همومي في البلا انت المعاذ
من عمومي في الخطا انت الملاذ

بالتفات منك همي ينجلي
تمہاری ذرا سی توجہ میں تمام غم میرے دور ہوتے ہیں

(۱۱)

يا امام الحي يا ذا الافتخار
يا علي الله عونا يا علي
اے علی خدا کے مددگار اے علی

يا رفيع الشان يا ذا الاقتدار
يا عظيم القدر يا ذا الاعتبار

بالتفات منك همي ينجلي
تمہاری ذرا سی توجہ سے تمام غم میرے دور ہوتے ہیں

(۱۲)

ها انا العبد الضعيف العاجز
يا علي الله عونا يا علي
اے علی خدا کے مددگار اے علی

يا علي بالله انت الفائز
ان في الدارين انت محمد جائز

بالتفات منك همي ينجلي
تمہاری ذرا سی توجہ میں تمام غم میرے دور ہوتے ہیں

(۳)

بِالتِفَاتٍ مِنكَ هَمِّي يَنجَلِي

تمہاری ذرا سی توجہ سے تمام غم دور ہو جاتے ہیں

(۴)

بِالتِفَاتٍ مِنكَ هَمِّي يَنجَلِي

تمہاری ذرا سی توجہ سے تمام غم دور ہو جاتے ہیں

(۵)

بِالتِفَاتٍ مِنكَ هَمِّي يَنجَلِي

تمہاری ذرا سی توجہ سے تمام غم دور ہو جاتے ہیں

(باقی)

دو سیمینار

از ضیاء الدین اصلاحی

(۱) علامہ شبلی۔ شخصیت اور فن

جنوری ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہوا، اسی میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا، جس کے پہلے سکریٹری علامہ شبلی منتخب ہوئے، ان کی باوزن شخصیت اور ان کے غیر معمولی جوش و سرگرمی کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں انجمن کو بڑا فروغ و اعتبار نصیب ہوا مگر جب ندوۃ العلماء کی خدمت کا خیال علامہ کے دل و دماغ پر چھایا تو اس کے سامنے ان کی ساری سرگرمیاں کم ہوگئیں، چنانچہ انجمن کا کام بھی دوسروں کے حوالے کر کے وہ خود لکھنؤ چلے آئے۔ انجمن سے ان کے اس تعلق، ان کی کثیر الجہات شخصیت اور گوناگوں عظیم الشان علمی، ادبی اور مذہبی خدمات کی بنا پر انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام اردو گھر نئی دہلی میں ۱۴-۱۵-۱۶ اپریل ۱۹۹۵ء کو "علامہ شبلی۔ شخصیت اور فن" کے موضوع پر کل ہند سیمینار منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے مختلف حصوں کے ارباب علم و قلم شریک ہوئے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے موجودہ جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم ایک متحرک و فعال ہی نہیں بڑے باغ و بہار شخص ہیں، ان کی مقناطیسی شخصیت اور علامہ شبلی کی عظمت و مقبولیت کا یہ کرشمہ تھا کہ اس سیمینار میں برگزیدہ اور منتخب اشخاص جمع ہو گئے تھے جنھوں نے

علامہ شبلی کی شخصیت اور کمالات کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے لیے تقریریں کیں اور مقالے پڑھے، یہاں شرکاء کے ناموں کی ایک فہرست کسی ترتیب کو مدنظر رکھے بغیر پیش کی جاتی ہے، جس سے سیمینار کے باوقار اور کامیاب ہونے کا اندازہ ہوگا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں، مسٹر یونس سلیم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب مظہر امام، جناب رشید حسن خاں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب محمود دیوان (لندن) ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، جناب عبداللطیف اعظمی، پروفیسر صغرا مہدی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالمغنی، جناب ابوالفیض سحر، جناب کشمیری لال ذاکر، پروفیسر ظہور الدین، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، جناب ظفر اسلم، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر بیگ احساس، جناب فاطمہ وصیہ جائسی، جناب ظفر الدین احمد، ڈاکٹر کاظم علی خاں، پروفیسر عبدالحق، جناب ضیاءالدین انصاری، جناب احمد سعید، جناب فہمیدہ بیگم، جناب شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر تنویر احمد علوی، قاضی عبیدالرحمن ہاشمی، جناب شاہد ماہلی، جناب رفعت سروش، جناب آغا منصور، جناب شمیم جہاں صاحبہ۔

جناب شہباز حسین، جناب مظہر حسین اور ڈاکٹر خلیق انجم اور ایم حبیب خاں تو سمینار کے روح رواں بنے ہوئے تھے اور یہ خاکسار بھی لہو لگا کر شہیدوں میں شامل تھا۔

سمینار کے کل چھ اجلاس ہوئے۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز ڈاکٹر خلیق انجم کی تعارفی تقریر سے ہوا، جس میں علامہ شبلی کے حالات اور کارناموں نیز انجمن سے ان کے تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی گزشتہ اور موجودہ خدمات بیان کیں اور اس کے اس منصوبے کا ذکر کیا جو اس نے عظیم شخصیتوں پر سمینار کا بنایا ہے اور جس کی ایک کڑی یہ سمینار بھی تھا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے سمینار کا باقاعدہ افتتاح کرتے ہوئے علامہ شبلیؒ کی عظمت

آشکارا کی، انہوں نے سر سید احمد خاں کا تذکرہ کرتے ہوئے دونوں کو دیوہیکل اور عہد ساز شخصیتیں بتایا، اس ضمن میں دونوں کے تعلقات و اختلافات کا مبصرانہ جائزہ لیا جو اتنا متوازن تھا کہ دونوں کے غالی عقیدتمندوں کو بھی اس سے اختلاف کی گنجایش نہیں ہوسکتی تھی۔

اس موقع پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے نشاۃ ثانیہ اور علامہ شبلی کے عنوان سے جو مقالہ پیش کیا اس میں انہیں نشاۃ ثانیہ کا علمبردار بتایا گیا تھا۔

بہار کے سابق گورنر مسٹر یونس سلیم نے اپنی پُرمغز تقریر میں علامہ شبلیؒ سے اپنی عقیدت و شیفتگی کا ذکر کرتے ہوئے انہیں اردو زبان و ادب کی ممتاز و مایہ ناز شخصیت قرار دیا۔ آخر میں اس مجلس اور انجمن کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے علامہ شبلی کو مختلف الجہات شخصیت کا حامل اور اقلیم نظم و نثر کا تاجدار قرار دیا، انہوں نے علامہ کی تاریخ دانی، سوانح و تنقید نگاری اور تاریخی نظموں کا ذکر خاص طور پر کیا۔

مقالات خوانی کے چار اجلاس ہوئے، جن میں علامہ شبلیؒ کی شخصیت اور کمالات کے مختلف پہلوؤں پر مفید اور پُرمغز مضامین پڑھے گئے، ان میں انکی عظمت و فضیلت اور شعر و ادب میں برتری اور فوقیت دکھائی گئی تھی، ان مقالات پر اچھی بحث و گفتگو ہوئی اور ان سے اسکا اندازہ بھی ہوا کہ مولوی عبدالحق مرحوم اور شیخ اکرام وغیرہ نے علامہ پر جس قسم کے اعتراضات کیے تھے اب انکو زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی ہے، بلکہ عام طور پر علامہ کے فضل و کمال کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔

مقالات کے اجلاس الگ الگ مجلس صدارت کی نگرانی میں ہوے جو چار پانچ اشخاص پر مشتمل ہوتی تھی، ایک اجلاس کی مجلس صدارت میرے حصہ میں بھی آئی۔ اجلاس کی کارروائی ناظمین نے بڑی خوبی سے انجام دی۔ علامہ شبلیؒ پر اس اچھے اور کامیاب سمینار کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم اور انجمن کے تمام کارکن مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(۲) رابطہ ادب اسلامی کا گیارہواں علمی مذاکرہ

رابطہ ادب اسلامی کا گیارہواں علمی مذاکرہ "ادب میں سفرناموں کی اہمیت" کے موضوع پر جامعہ کاشف العلوم اورنگ آباد کے زیر اہتمام ۷-۸-۹ اپریل ۱۹۹۵ء کو ہوا جس میں مختلف عصری جامعات اور دینی مدارس کے اہل علم شریک ہوئے۔ اسکا افتتاحی جلسہ رابطہ کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی صدارت میں مہانگر پالیکا کے وسیع نہرو بھون میں ہوا، اس میں الحاج غلام محمد بیٹنی کا خطبۂ استقبالیہ پڑھا گیا جو اورنگ آباد کی علمی و تاریخی اہمیت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے فضائل اور مندوبین اور مہمانوں کے خوش آمدید پر مشتمل تھا، پھر رابطہ کے سکریٹری مولانا سید محمد رابع ندوی نے اپنی رپورٹ میں رابطہ کی سرگرمیوں اور آئندہ کے پروگرام کا ذکر کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے صدارتی خطبہ میں ان آیات کی بلیغ اور دلنشین تشریح کرکے سفر کی اہمیت و افادیت اور اسکے متعلق اسلامی تعلیمات کی وضاحت فرمائی جو قاری صاحب نے ذوالقرنین کے سفر مشرق و مغرب کے متعلق جلسہ کی ابتدا میں تلاوت کی تھیں۔

مقالات کی سات نشستیں ہوئیں جن میں سفرناموں کے متعلق دو درجن سے زیادہ مقالے پیش ہوئے۔ ۳ مقالے عربی میں اور ایک انگریزی میں تھا۔ آخری نشست میں بعض تجویزیں منظور کی گئیں۔

یہ نشستیں مختلف حضرات کی صدارت و نظامت میں ہوئیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی معذوری کے باوجود بعض نشستوں میں شرکت فرماتے رہے، ان کی حیثیت ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

کی ہے۔ اورنگ آباد میں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر قدردانوں نے وہاں "پیام انسانیت" اور "اصلاح معاشرہ" کے علاوہ بعض اداروں کے افتتاح اور سنگ بنیاد کے جلسے کیے اور مدرسہ کاشف العلوم میں درس بخاری کا افتتاح بھی ہوا۔ ہر ایک میں موقع و محل کے لحاظ سے مولانا کا خطاب موثر اور دلنشین رہا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کا ستائیسواں اجلاس عام

از عمیر الصدیق دریابادی ندوی۔

۱۳، ۱۴، ۱۵ اپریل کو مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کا ستائیسواں اجلاس ضلع مئو ناتھ بھنجن میں منعقد ہوا، اڑسٹھ ۶۸ سال پہلے ۱۹۲۶ء میں اسی شہر میں جمعیت کا ایک نہایت کامیاب اجلاس ہوا تھا۔ اب یہ اجلاس گویا اس کا نقش ثانی تھا اور جسے بہتر بنانے کے لیے شبانہ روز کی محنت و مشقت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا تھا، اس اجتماع کا خاص مقصد دعوت الی اللہ، احیائے توحید و سنت اور ملی بیداری و اتحاد کا پیغام عام کرنا تھا، ضمناً تحریک اہل حدیث سے وابستہ افراد کے لیے جماعت اور اکابر سلف کی تاریخ کی تجدید و بازخوانی بھی اس کے مقاصد میں شامل تھی، حسب توقع جمعیۃ کے ذمہ داروں خصوصاً اس کے فعال اور سر دم رواں بیہم دواں امیر مولانا مختار احمد ندوی کی قیادت میں یہ اجتماع بھی کامیابی سے ہم کنار ہوا، جس کا اندازہ مندوبین و شرکاء کی حاضری، حسن انتظام، رضاکاروں کے سلیقہ و قرینہ سے ہوتا تھا، سب سے بڑھ کر خلوص و دردمندی، متانت و شائستگی اور اعتدال و توازن کی خوبیاں عام طور سے مقالوں اور تقریروں میں محسوس کی گئیں، مختلف نشستوں میں یہ مسائل موضوع بحث رہے، دعوت اسلام کی عصری معنویت، ملت اسلامیہ کا اتحاد قرآن و حدیث کی روشنی میں، خواتین اسلام اور ان کی ذمہ داریاں، موجودہ انسانی معاشرہ کی اخلاقی ضروریات اور جماعت اہل حدیث کے اصول و مقاصد، مولانا مختار احمد ندوی کے خطبۂ صدارت

مولانا مقتدی حسن ازہری کے خطبہ استقبالیہ اور مولانا عبدالوہاب خلجی کے احساسات گویا اجلاس کی کارروائی کا متن اور رہنما اصول تھے جن کی شرح و تفصیل بقیہ اجلاسوں میں ہوتی رہی، مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری اور مولانا ظہیرالدین اثری جیسے بزرگ قائدین کی عملی شرکت سے بھی اجلاس کے وزن و وقار میں اضافہ ہوا، برطانیہ، متحدہ عرب امارات، کویت اور نیپال سے علماء کی نمائندگی ہوئی، ہندوستان سے جماعت کے اہم علماء کے علاوہ غیر جماعتی اشخاص بھی شامل ہوئے، پروگرام کے مطابق امام حرم شیخ ابن السبیل، ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی، شیخ عبدالرحمن عبدالخالق اور دوسرے علمائے عرب اور ہندوستان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دیگر علماء کی شرکت بھی متوقع تھی، لیکن یہ حضرات کسی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، دارالمصنفین سے مولانا ضیاءالدین اصلاحی بھی شریک نہ ہوسکے، کیونکہ عین ان ہی تاریخوں میں دلی کے علامہ شبلیؒ سمینار میں شرکت کی وہ پہلے ہی منظوری دے چکے تھے، راقم اور مولانا محمد عارف عمری رفیق دارالمصنفین نے اجلاس میں شرکت کی سعادت حاصل کی، مدرسہ عالیہ سے اجلاس گاہ تک خوش سلیقگی اور نظم وضبط سے مقامی رضا کاروں کی سخت محنت، تن دہی و جانفشانی کا اندازہ ہورہا تھا، موسم میں شدت تھی اس کے باوجود دن کی نشستوں میں سامعین کی تعداد خاصی ہوتی تھی جو رات کے جلسوں میں اور سوا ہوجاتی تھی، سہولت کے پیش نظر جگہ جگہ ٹی وی سیٹ نصب کیے گئے تھے، ٹھنڈے پانی اور شروبات کی کمی نہیں تھی، اس طرح جسم و روح کی تازگی وطراوت کا یکساں نظم تھا، دعا ہے کہ اس اجلاس سے مسلمانوں میں کتاب و سنت سے تعلق، شرک و بدعت سے اجتناب، اور ملی وقومی اتحاد و اخوت کو مضبوط و مستحکم بنانے کا عمل اور تیز تر ہو۔

استفسار و جواب

بہار میں اورنگ زیب

جناب وارث ریاضی
دیوراج۔ چمپارن۔ بہار

ہماری بستی دیوراج سے پورب دکھن کی جانب تقریباً ۸ میٹر کے فاصلہ پر ایک قصبہ لوریا ہے، یہ دیوراج کا بلاک اور گرام ہے، یہاں ایک میدان میں اشوک کی لاٹ ہے، جس پر دکھن جانب تقریباً ڈیڑھ فٹ اوپر کلمہ طیبہ کندہ ہے اور اس کے ٹھیک نیچے نہایت ہی خوشخط محی الدین اورنگ زیب عالمگیر غازی سنہ ۱۰۷۱ھ کندہ ہے، سن پر تجری کی علامت مٹ گئی ہے، کیا ضلع چمپارن میں عالمگیرؒ کے آنے کی شہادت ملتی ہے؟

معارف: چمپارن کیا پورے بہار میں اورنگ زیب عالمگیر کی آمد کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، شاہجہاں کی زندگی میں اس پورے علاقہ کا گورنر شاہزادہ شجاع تھا، اورنگ زیب نے تخت نشینی کے بعد اس علاقہ کے حصول کے لیے اپنے بیٹے محمد سلطان اور سپہ سالار میر جملہ کو روانہ کیا، انھوں نے شجاع کو شکست دی اور اس کی جگہ میر جملہ بنگال و بہار کا گورنر مقرر کیا گیا، ۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۱ء اورنگزیب کی تخت نشینی کا چوتھا سال ہے اور اس سال کے اہم واقعات میں کوچ بہار اور آسام کی فتوحات بھی شامل ہیں، ممکن ہے چمپارن میں بھی عالمگیری لشکر نے اپنے فاتحانہ سفر میں مذکورہ عبارت بطور یادگار کندہ کرادی ہو۔

ع۔ ص

معارف کی ڈاک

مکتوب ندوۃ العلماء

ندوہ۔ لکھنؤ / ۵ مئی ۱۹۹۵ء

محترم المقام مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں اپنے پروگرام کے مطابق اعظم گڈھ سے سیوان نہ جاسکا، برادرم مولانا عمیر الصدیق صاحب نے بتایا ہوگا۔ والخیر فیما یختارہ اللہ، شبلی منزل میں ایک شب و روز بہت اچھے گزرے، موسم کی سختی کو آپ کے لطف و مدارات نے خوشگوار بنادیا، شبلی منزل کے احاطہ میں آم کے درختوں میں نئی کیریاں اور آپ کی سرکردگی میں شایع ہونے والی نئی کتابیں اور تحقیقات دیکھ کر مسرت ہوئی اور امید بندھی کہ یہ باغ انشاء اللہ یوں ہی ہرا بھرا رہے گا، مولوی عارف کی کتاب تذکرہ مفسرین ہند راستے میں مطالعہ کرتا رہا، تحسین و ترقی کی گنجایش سے انکار نہیں لیکن مجموعی طور پر دار المصنفین کا معروف انداز بحث و تحقیق دیکھ کر خوشی ہوئی، آپ اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی علمی و فنی رہنمائی قابل قدر و لایق شکر ہے۔

سید صاحبؒ کے نام مشاہیر کے خطوط بھی بہت کام کی چیز ہے، اس سے اس صدی کے ربع اول کی تاریخ کی بہت سی کڑیاں باہم مربوط ہوسکتی ہیں۔ معارف کا معیار قائم رکھنا اور دشواریوں کے باوجود پابندی سے اسکا نکلتا رہنا آپ کا کارنامہ بھی ہے اور کرامت بھی۔

آپکے تمام رفقائے کار اختشام علی صاحب رحیم آبادی، مولانا عارف العمری الاعظمی مولانا عمیر الصدیق ندوی اور جناب عبد المنان ہلالی صاحب کے اخلاق و کرم گستری کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

عبد اللہ عباس الندوی۔

مطبوعات جدیدہ

تلاش میر

از پروفیسر نثار احمد فاروقی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت اور طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۶، قیمت ۹۵ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲ راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

میر تقی میر کی شخصیت و شاعری پر تحقیق و تنقید کا فریضہ ادا کرنے والوں میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کا نام نمایاں ہے، کلام میر کی پُر خوں گلابی سے وہ عرصہ سے سرشار ہیں، برسوں پہلے انہوں نے ذکر میر کا اردو ترجمہ شایع کیا تھا، دلی کالج میگزین کے میر نمبر کی اشاعت بھی ان کا کارنامہ ہے، میر کے اس مطالعہ کے دوران میں ان کے قلم سے برابر ایسی تحریریں نکلتی رہیں جو دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی میں شور انگیز سے زیادہ شعور انگیز ثابت ہوئیں، زیر نظر کتاب ایسے ہی بعض منتخب مضامین پر مشتمل ہے، اس کا پہلا ایڈیشن قریبا ربع صدی قبل شایع ہوا تھا یہ اس کا طبع جدید ہے، کل نو مضامین میں میر کے آرٹ، مطالعہ میر کے امکانات اور میر اور یقین اور میر اور سعادت علی کے علاوہ تذکرہ معشوق چہل سالہ اور میر کی مثنویوں پر بھی تحریریں ہیں جن سے بجا طور پر اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ گو یہ متفرق موضوعات ہیں تاہم نئی بات اور نئی تحقیق سے خالی نہیں ہیں، ایک جگہ حسرت و حیرت سے لکھا گیا ہے کہ میر کو گوئے سبقت و فضیلت کے باوجود ایسے شارحین نہیں ملے جو غالب و اقبال کی قسمت میں تھے، فاضل مولف کے اس مجموعہ مضامین نے کسی حد تک اس کی تلافی کردی ہے، جس کے لیے وہ تحسین کے مستحق ہیں۔

باقیات عظیم الدین احمد

از ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۹۶، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا مجموعہ کلام گل نغمہ کے نام سے ان کے لائق و نامور صاحبزادے پروفیسر کلیم الدین احمد نے عرصہ ہوا مرتب کیا تھا، لیکن ان کے مضامین جو زیادہ تر ان کے رسالہ ماہنامہ معاصر میں شایع ہوئے تھے، وہ اب تک اس کی فائلوں میں بکھرے ہوئے تھے، زیر نظر کتاب میں ان کے چار مضامین کو یکجا کیا گیا ہے اور بعض ایسی نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں جو گل نغمہ میں آ نہیں سکی تھیں، پہلا مضمون فلسفہ عشق مجازی پر ہے، باقی تین مضامین میر تقی میر، راسخ عظیم آبادی اور مومن خاں مومن کی شاعری کے متعلق ہیں، ان میں میر والی تحریر سب سے بڑی ہے اور دلچسپ بھی، کلام میر سے پر لطف نکات و نتایج برآمد کیے گئے ہیں مثلاً "میر صاحب پر حسن و عشق کے اثرات سارے کے سارے تخریبی ہیں، اشعار میں موسیقی و ترنم موجود ہے مگر..... امید افزا اور رقص آور نغمہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا،" "راسخ عظیم آبادی میر صاحب ہی کے شاگرد ہیں مگر ان پر حسن و عشق کے تعمیری اثرات بھی کسی قدر منکشف ہو گئے ہیں۔" شروع کی تعارفی تحریر میں عظیم الدین احمد کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کے ضمن میں موسیقی، خوش خطی، مصوری اور شاعری وغیرہ کے ساتھ پان اور حقہ کے شوق کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

مسیحا کون؟ سرسید یا آزاد

از جناب ڈاکٹر عارف الاسلام، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۱، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۱۹۸۷ء میں میرٹھ کے مسلم کش فسادات کے بعد عام طور سے مسلم مسائل کی پیچیدگی اور اس کے حل کی تلاش کا موضوع مختلف حلقوں میں زیر بحث رہا، خصوصاً نئی نسل کے دانشور اس سلسلہ میں زیادہ مضطرب نظر آئے، زیر نظر کتاب اسی نئی ترجمانی کا نمونہ ہے، جس میں ہوش پر جوش غالب ہو گیا ہے۔ مولف کی نظر میں سرسید کی قیادت کی مثال ہندوستانی مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں نہیں ملتی، اختلاف کی گنجائش کے باوجود بہرحال سرسید کی دوراندیشی، دوربینی، خلوص و دردمندی اور جاں سوزی سے انکار ممکن نہیں، سرسید کی مسیحا نفسی مسلم لیکن کیا اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا موازنہ بھی ضروری اور مناسب ہے؟ مولانا کی قوم پروری، کانگریس سے وابستگی اور اس راہ میں مخالفین سے نبرد آزمائی کے مطالعہ اور تجزیہ سے اس صدی کے ہندوستان کی مسلم تاریخ کو سمجھنے میں یقیناً نئے گوشے اور زاویے سامنے آئیں گے، لیکن تاریخ کا مطالعہ غیر جانبداری کا متقاضی ہے ورنہ اس قسم کے جملوں اور حملوں سے کون بچ سکتا ہے کہ "انسانیت کی تاریخ میں ایسے کسی دوسرے معیار کے لیڈر کی مثال ملنی مشکل ہے"۔

حیات وحشت

از جناب ڈاکٹر وفا راشدی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت اور طباعت بہتر، صفحات ۱۹۲، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: مکتبہ اشاعت اردو ۲/۹۵ بی-۹، رفاہ عام سوسائٹی ملیر ہالٹ، کراچی ۴۳۔

رضا علی وحشت کلکتوی کے کلام و ادبی کمال کا اعتراف مولانا شبلی و حالی اور اکبر و اقبال جیسے ارباب کمال نے کیا، اس کتاب کے مولف ان کے خاص تلمیذ رشید ہیں، انہوں نے اپنے استاد کے سوانح اور کمالات کو نہایت جامعیت سے اس مختصر کتاب میں پیش کر دیا ہے، اردوئے بنگال کی تاریخ پر مولف کی خاص نظر ہے اور اس کا

احساس اس کتاب کے مطالعہ میں جابجا ہوتا ہے۔

اوراق جاوداں مرتبین جناب راہی فدائی اور جناب نظام الحق عابد، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۴، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: جاوید انڈسٹریس، چامراج نگر، ضلع میسور کرناٹک ۵۷۱۳۱۳۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ اکابر و مشاہیر کے ایک مکتوب الیہ جناب حکیم محمد نور الحق جاوید تھے، جن کا تعلق کرناٹک کے ایک چھوٹے سے شہر چامراج نگر سے تھا، خطابت و طبابت کے علاوہ قومی و ملی کاموں میں ان کا دائرہ بہت وسیع رہا، اہل علم و فضل سے ان کا تعلق بھی اسی وجہ سے قائم و استوار رہا اور اس کا ایک ثبوت خطوط کا یہ مجموعہ بھی ہے، لائق مرتبین نے ضروری حواشی کا اہتمام بھی کیا ہے۔

انا البحر از عبدالسلام اظہر مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۳۶، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: بزم ارباب ذوق، ۸۶، بیلباغ، مالیگاؤں، ضلع ناسک ۴۲۳۲۰۳۔

عبدالسلام اظہر اچھے شاعر تھے، ان کی غزلوں میں جدت و ندرت تھی، انکی اٹھان غضب کی تھی لیکن محض تیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا، ان کے کلام کی پختگی سے ان کی نوعمری کا اندازہ نہیں ہوتا، مناجات کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

پنجے میں زرد رت کے ہے ڈال ڈال ربی ۔ پیڑوں کو بخش دینا پھر سبز شال ربی

ان کی غزلیں پر کیف اور پر تاثیر ہیں، خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود

ع۔ ص۔

تصنیفات علامہ شبلیؒ و علامہ سید سلیمان ندویؒ

علامہ شبلیؒ	قیمت	علامہ سید سلیمان ندویؒ	قیمت
سیرۃ النبیؐ اول	۶۵-۰۰	سیرۃ النبیؐ سوم	۱۲۵-۰۰
〃 دوم	۵۰-۰۰	〃 چہارم	۱۲۵-۰۰
الفاروق	۹۵-۰۰	〃 پنجم	۶۰-۰۰
المامون	۵۰-۰۰	〃 ششم	۱۲۵-۰۰
الکلام	۵۰-۰۰	〃 ہفتم	۳۵-۰۰
علم الکلام	۳۵-۰۰	خطبات مدراس	۲۵-۰۰
اسلام اور مستشرقین چہارم	۴۰-۰۰	الرسالۃ المحمدیہ (ترجمہ خطبات مدراس عربی)	۴۰-۰۰
شعر العجم اول	۴۰-۰۰	رحمت عالم	۱۰-۰۰
〃 دوم	۳۵-۰۰	تاریخ ارض القرآن دوم	۳۰-۰۰
〃 سوم	۲۵-۰۰	عرب و ہند کے تعلقات	۷۵-۰۰
〃 چہارم	۳۵-۰۰	سیرت عائشہؓ	۴۰-۰۰
〃 پنجم	۲۵-۰۰	حیات شبلیؒ	۹۰-۰۰
کلیات شبلی اردو	۲۵-۰۰	یاد رفتگاں	۵۰-۰۰
مکاتیب شبلی اول	۴۰-۰۰	رسالہ اہلسنت والجماعت	۱۰-۰۰
〃 دوم	۳۰-۰۰	اسلام اور مستشرقین پنجم	۲۵-۰۰
مقالات شبلی (مکمل سیٹ)	۲۲۰-۰۰	دروس الادب اول	۵-۰۰
		〃 دوم	۵-۰۰
خطبات شبلی	۲۵-۰۰	شذرات سلیمانی	۴۵-۰۰
		برید فرنگ	۲۵-۰۰
انتخابات شبلی	۲۵-۰۰	نقوش سلیمانی	۶۰-۰۰
		خیام	۶۵-۰۰
		مقالات سلیمان سوم	۴۵-۰۰